UNIVERSAL LIBRARY
OU_222958
UNIVERSAL LIBRARY

جلد چہارم
اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء
حصۂ شانزدھم

اُردو

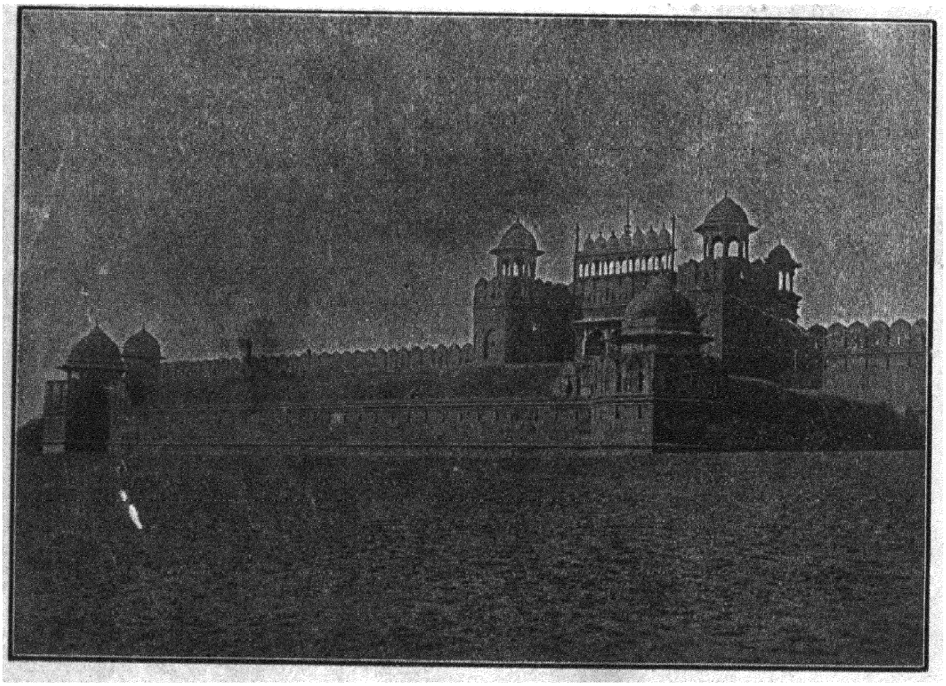

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحه
۱	سب رس	مولوی عبدالحق صاحب بی-اے اڈیٹر	۱
۲	فردوسی کا مذهب	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے	۲۷
۳	موسیقی	مولوی محمد حسین صاحب عرشی امرتسری	۴۰
۴	اردو زبان کے متعلق ضروری اعداد	مولوی سید هاشمی صاحب رکن دارالترجمه حیدرآباد	۴۲
۵	سویڈی ادبیات میں رومان کی حیثیت	مسز صالح حیدری آی-سی-ایس	۵۲
۶	وه پهول هوں جس کا پهل نهیں هے	مولوی محمد عظمت الله خاں صاحب بی-اے	۷۵
۷	جاپان کی بعض همعصر شاعرات	مترجمه مولوی سید هاشمی صاحب	۸۱
۸	بحرالمحبت (مصحفی)	مولوی عبدالماجد صاحب بی-اے	۹۷
۹	تبصرے	اڈیٹر	۱۰۵

سب رس

اردو نثر کی ایک قدیم کتاب

(از مولوی عبدالحق صاحب بی-اے اڈیٹر)

اردو زبان کے تذکرہ نویسوں نے اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب شاہ فضل اللہ فضلی کی دہ مجلس بتائی ہے جو کربل کتھا کے نام سے بھی مشہور ہے - یہ کتاب محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں سنہ ۱۱۴۵ ھجری میں لکھی گئی - اس وقت تک کوئی دوسری کتاب نثر کی دریافت نہیں ہوئی تھی اس لئے تقدم کا فخر اسی کو حاصل ہوا - میں ایک مدت سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے لئے سامان بہم پہنچا رہا ہوں - اس تحقیق و جستجو میں بہت سی قدیم نظم و نثر کی ایسی کتابیں دستیاب ہوئیں جو بالکل نایاب ہیں اور ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں - ان میں سے ایک کتاب سبرس ہے - ان صفحات میں میں اس کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں —

اس کتاب کے مصنف مولانا وجہی ہیں جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے متوسلین میں سے تھے - سلطان عبداللہ قطب شاہ بن سلطان محمد قطب شاہ سنہ ۱۰۳۶ ھجری میں تخت نشین ہوئے اور سنہ ۱۰۸۳ ھجری تک سریر آرائے حکومت رہے - قطب شاہی بادشاہ خود صاحب علم تھے اور اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے - سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی اپنے زمانہ میں اہل ہنر کا بہت بڑا سرپرست تھا - برہان قاطع انہیں کے نام سے تالیف ہوئی اور اور بعض کتابیں بھی اس عہد میں لکھی گئیں - سب رس بھی وجہی نے سلطان ہی کی فرمائش سے تصنیف کی - جس کی کیفیت میں خود مصنف ہی کے الفاظ میں آگے چل کر بیان کرونگا - افسوس ہے کہ مصنف نے کتاب میں کہیں سنہ تصنف نہیں لکھا - مجھے اس کتاب کے دو نسخے دستیاب ہوئے - ایک کئی سال ہوئے حیدرآباد میں ملا اور دوسرا بیجاپور میں - دونوں نسخے خوشخط اور بہت صاف ستھرے لکھے ہوئے ہیں جس سے مجھے مقابلہ اور صحت میں بہت مدد ملی - یہ دونوں نسخے تقریباً ایک صدی بعد کے لکھے ہوئے ہیں ایک نسخے کے آخر میں سنہ کتابت کے ساتھ یہ عبارت لکھی ہوئی ہے —

"الحمداللہ کہ نسخۂ سبرس پچیسویں جمادی الاول سنہ ۱۱۷۱ ھجری روز

۱ تو ار در قلعۂ مبارک دولت آباد تمام ہوئی-تصنیف میاں وجہی قدس سرہ-
بخط فقیر پر تقصیر محمد واصل حیدری بجہۃ یادگارے نوشتہ شد......"
دوسرے نسخے کے آخر میں یہ الفاظ ہیں—
"تمت الکتاب بعون اللہ ملک الوہاب بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم
چہارشنبہ سنہ ۱۱۷۷ ہجری نبویہ"

سلطان عبداللہ ساڑھے گیارہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوے-اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۱۰۴۰ کے بعد کی تصنیف ہے-یعنے فضلی کی دہ مجلس سے تخمیناً ایک صدی قبل کی سمجھنی چاہئے-غواصی بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر اور میاں وجہی کا ہم عصر ہے-اس کی مثنوی طوطی نامہ کا سنہ تصنیف ۱۰۲۷ ہجری اور ایک دوسری مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ۱۰۳۵ ہجری ہے-سب رس بھی اسی کے لگ بھگ لکھی گئی ہے—

اگرچہ اس سے قبل کی بھی نثریں ملتی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر مذہب یا تصوف سے ہے لیکن یہ کتاب ہر حیثیت سے بہت عجیب و غریب ہے اور بعض خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز درجہ رکھتی ہے-ایک تو یہ کہ اول سے آخر تک ایک مسلسل قصہ ہے دوسرے اس میں ادبی شان پائی جاتی ہے اور اس زمانے کی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے-تیسرے شروع سے خاتمے تک مقفیٰ عبارت میں لکھی ہوئی ہے-یہ یقیناً فارسی کا اثر معلوم ہوتا ہے-ملا ظہوری کی سہ نثر جو ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس کی تقریظ یا دیباچہ ہے اس سے قبل تصنیف ہو چکی اور شہرت پاچکی تھی-اس کتاب (سب رس) کو دیکھتے ہی رجب علی سرور کی مشہور کتاب فسانۂ عجائب کا خیال آتا ہے-ظہوری کے تکلفات اور استعارات و تشبیہات کی پیچیدگیاں اور اس کی بلند پروازی ایسی ہے کہ سہ نثر کا ان کتابوں سے مقابلہ کرنا گویا ایک پہاڑی ندی کا باغ کی نہر سے مقابلہ کرنا ہے-تاہم فسانۂ عجائب تکلف و تصنع سے خالی نہیں اور نثر میں قافیہ کا التزام بذات خود ایک ایسی چیز ہے کہ تکلف اور آورد کے بغیر چارہ نہیں-مگر اس پر بھی سب رس کا بیان فسانۂ عجائب کے مقابلے میں بہت سادہ ہے-یہ اور بات ہے کہ بعض پرانے الفاظ اور محاورے اس وقت سمجھ میں نہیں آتے لیکن سادہ بیانی-عبارت کی روانی اور سلاست میں کلام نہیں—

رہا قصہ سو برائے نام ہے-اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں-وہ چند صفحوں میں آسکتا ہے لیکن کتاب کا حجم ۲۷۶ صفحے ہے اور ہر صفحے میں ۱۷ سطریں ہیں-یہ عام قصوں سے بالکل الگ ہے-ملا وجہی نے مجاز سے حقیقت کی طرف رہنمائی کی ہے اور حسن و عشق کی کش مکش اور عشق اور دل کے معرکے کو قصے کے پیرائے میں

بیان کیا ھے- جو کتاب سے الگ کر لیا جائے تو چند صفحوں سے زیادہ نہیں- لیکن ھے یہ کہ ملا صاحب نے جگہ جگہ پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ھے اور کہیں کہیں تصوف کے اسرار جو ھمارے ھاں اب معمولی باتیں ھو گئی ھیں بیان کرنے شروع کر دئیے ھیں- یہ بھی نہیں کہ دس پانچ سطریں لکھ دیں بلکہ صفحے کے صفحے رنگ دئیے ھیں- باتیں معقول ھیں صاف ستھری ھیں- نصیحتیں کام کی ھیں- بیان اچھا ھے لیکن قصے میں جب وعظ شروع کر دیا جائے تو قصے کا لطف کم ھو جاتا ھے اور پڑھنے والے کو الجھن ھوتی ھے- مثلاً عقل کا ذکر آیا تو عقل کی تعریف میں کئی صفحے لکھ ڈالے- شہزادے کی شراب نوشی کا بیان آیا تو شراب کی تعریف اور بادشاھوں کے لئے مکر و ریا کے مقابلے میں اس کے جواز پر بحث شروع کر دی- عشق کے مقام پر عشق پر گفتگو چھیڑ دی- کہیں حیا کی مدح اور سوال کرنے کی مذمت میں- کسی جگہ آب حیات کی خاصیت اور تعریف میں- کسی مقام پر ھمت کی تعریف میں- کہیں طمع کی برائی میں- کسی جگہ عشق- عاشق اور معشوق پر طویل بحثیں کرنے لگتے ھیں- اسی طرح مصیبت- فقر اور صبر- خواب- لڑائی اور بہادری- مشیروں اور مصاحبوں کے انتخاب- عورت کی محبت- سوکن کے جلاپے- بادشاھت کے فرائض وغیرہ پر اپنے خیالات بے تکلف لکھتے چلے گئے ھیں- اگر ان تمام مباحث کو الگ نکال لیا جائے تو مضامین وعظ کی اچھی خاصی کتاب تیار ھو سکتی ھے- میرا قیاس ھے کہ یہ کتاب اس زمانے میں بہت مقبول ھوئی اور لوگ صرف قصے کی خاطر نہیں بلکہ پند و موعظت کی کتاب سمجھ کر اسے شوق سے پڑھتے تھے چونکہ عبارت اس کی مقفیٰ اور آسان اور سلیس اور روزمرہ کی گفتگو میں تھی اس لئے عام و خاص اسے پڑھ کر ضرور خوش ھوتے ھونگے—

اصل قصہ یہ ھے

نقل ھے کہ ایک شہر تھا جس کا نام تھا سیستان- وھاں کا ایک بادشاہ تھا جس کا نام عقل تھا- عقل کے ایک بیٹا تھا دل نام- جو شراب بہت پیتا تھا- ایک روز عالم مستی میں ایک ندیم نے آب حیات کا قصہ پڑھ کر سنایا اور اس کی تعریف کے پل باندھ دئیے کہ جو کوئی اسے ایک دفعہ بھی پی لیگا تو موت سے نجات پائیگا اور خضر کی طرح ھمیشہ زندہ و سلامت رھیگا- شہزادۂ دل کو اس کا اشتیاق پیدا ھوا اور یہ دھن سمائی کہ جس طرح ھو اسے حاصل کیجئے- بغیر آب حیات کے زندگی عبث ھے دن رات اسی فکر میں رھنے لگا- دل کی بیقراری بڑھنے لگی اور عشق کی سی کیفیت پیدا ھونے لگی—

اس حال سے مصاحب- مشیر- دوست- آشنا- راجا پرجا سب حیران پریشان تھے اور کوئی تدبیر بن نہ آتی تھی- شاھزادے کا ایک جاسوس تھا نظر نام- وہ ھر مقام پر

پہنچتا اور جگہ جگہ کی خبر رکھتا تھا بہت ہوشمند اور صاحب فراست تھا اور ہر کام کے کرنے میں مستعد-جہاں کوئی نہ جا سکے وہاں وہ جائے-جو کام کوئی دوسرا نہ کر سکے وہ کر کے لائے-وہ حضوری میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضور مایوس نہوں-یہ جان نثار جاتا ہے اور آب حیات کی خبر لاتا ہے-شہزادہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اس کی محبت اور اخلاص کی تعریف کی-گلے لگایا اور خوشی خوشی اجازت دی—

اجازت لیکر نظر چلتا ہوا اور چلتے چلتے ایک شہر میں پہنچا جو بہت خوشحال اور سرسبز تھا اور لوگ وہاں کے بہت با سلیقہ اور مہذب تھے-شہر کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسے عافیت کہتے ہیں اور یہاں کے بادشاہ کا نام ناموس ہے-لیکن دل میں یہ دگدا تھی کہ جس کام کے لئے اس نے یہ کھکھیڑ اٹھائی ہے وہ کیونکر پورا ہو-آخر سوچتے سوچتے وہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا-بادشاہ اس کی طرز و روش کو دیکھ کر بہت خوش ہوا-اپنے پاس بٹھایا اور احوال پوچھا اول اول اسے دلی مقصد بیان کرتے حجاب معلوم ہوا-آخر شرم کو بالائے طاق رکھ کر منہ پھوڑ کر بولا کہ جہاں پناہ! میں آب حیات کی تلاش میں گھر سے نکلا ہوں-یہاں تک آیا ہوں شاید امید بر آئے-اس کے بعد بادشاہ کو سلام کر کے رخصت ہوا لیکن بہت ملول اور رنجیدہ تھا اور کوئی تدبیر سوجھ نہیں پڑتی تھی-لیکن خدا سے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئیگی—

اتنے میں ایک پہاڑ دیکھا جو بہت بلند تھا اس کے پاس گیا اور وہاں لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا جگہ ہے اور یہاں کون رہتا ہے-جواب ملا کہ یہ پہاڑ زہد و رزق کا مقام ہے وہاں جانا بہت کٹھن ہے-وہاں ایک بڈھا رہتا ہے جو بہت بزرگ اور اللہ والا ہے-اس کا نام رزق ہے-غرض وہ اس پہاڑ پر چڑھا اور رزق کے پاس پہنچکر سلام علیکم کہا-اس نے سلام کا جواب دیا-رزق نے پوچھا تم یہاں کیسے آئے اور کس نے تمہیں یہ رستہ دکھایا اور تمہارا کیا نام ہے-نظر نے اپنا مطلب بیان کیا اور آب حیات کی تلاش کا قصہ کہا-رزق نے فرمایا کہ آب حیات جس کی تلاش میں ہے نہ کسی باغ میں ہے نہ کسی کشت زار میں-البتہ یہ سنا ہے کہ بہشت میں ہے-اسے تم یہاں کہاں پاؤ گے--

آخر وہاں سے بھی مایوس ہوکر چلا-چلتے چلتے جنگل میں ایک کوٹ دیکھا جو سر بفلک تھا اور مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا-اس کوٹ کے پاس جاکر لوگوں سے پوچھا کہ اس کوٹ کا کیا نام ہے اور یہاں کا بادشاہ کون اور کیسا ہے-لوگوں نے جواب دیا کہ اس کوٹ کا نام ہدایت اور بادشاہ کا نام ہمت ہے-یہ سنکر اسے کسی قدر ڈھارس ہوئی کہ بارے ہمت کے پاس تو پہنچ گیا-شاید یہاں مراد بر آئے-ہمت کے پاس پہنچکر عرض کیا کہ آپ صاحب دولت-صاحب نصرت اور بادشاہ مملکت ہیں

آپ کا نام همت هے-میرا مقصد برلائیں اور مجھے میرے مطلوب تک پہنچائیں-همت اسے خلوت میں لے گیا-بہت کچھہ تسلی دلاسا دیا اور سارا حال سنکر کہا کہ تو ثابت قدم اور باوفا شخص هے جو میں کہوں سن اور میری بات گرہ میں باندہ-شاید اپنا مقصد پائے-مشرق میں ایک ولایت هے وهاں کے بادشاہ کا نام عشق هے-هر دل میں اس کا گھر هے-سب سے اس کا اتفاق هے اور کسی سے بگاڑ نہیں-لیکن وہ نہایت بے پروا اور سرمست هے-وہ ایک آگ هے جو بجھہ نہیں سکتی اور ایک پھانس هے جو نکل نہیں سکتی اس بادشاہ کی ایک بیٹی هے-بہت خوش رنگ-بہت خوش ڈھنگ چندے آفتاب-چندے ماهتاب-جس کے عشق میں هزاروں مجنوں و فرهاد هیں-کوہ قاف کے ادھر ایک شہر هے اور اس شہر میں ایک باغ هے جو تر و تازگی اور شادابی میں رشک بہشت هے-شہر کا نام دیدار اور باغ کا نام رخسار هے-باغ میں ایک چشمہ هے جس کا نام جگ جیون هے-پانی اس کا مصری سے میٹھا هے-اسی چشمے سے تجھے آب حیات ملے گا اور وهیں تو اپنا مقصد پائیگا اور عشق کی نازنین بیٹی حسن بہت ناز و انداز سے چاند سی سہیلیوں کے ساتھہ یہاں سیر کرتی اور اس چشمے سے پانی پیتی هے—

همت یہ کہ کر خاموش هو گیا-نظر یہ سنکر بیخود رہ گیا-دونوں بیخود و بیہوش هو گئے ایک کو ایک کی سرت نہ رهی-کچھہ دیر بعد دونوں کو هوش آیا-حیران پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے-آخر همت نے کہا کہ اب میں تجھہ سے کیا کہوں اور سچ یہ هے کہ چپ بھی نہیں رها جاتا-تو عاقل و دانشمند هے-صاحب فراست اور هوشیار هے-لیکن شہر دیدار تک پہنچنا بہت دشوار هے-رستے میں بڑی بڑی آفتیں هیں-آگے چل کر ایک شہر هے جس کا نام سبکسار هے جس کا نام دیو رقیب نامی هے مگر عشق بادشاہ کے تحت میں هے-وہ دیدار شہر کا نگہبان هے اور اغیار کو شہر میں آنے نہیں دیتا-تمہاری مجال نہیں کہ وهاں گھسنے پاؤ-البتہ وهاں میرا ایک سگا بھائی هے جس کا نام قامت هے-وہ بہت قبول صورت بلند بالا هے-میں اس کے نام ایک سفارشی خط لکھے دیتا هوں اور اس میں تیرا سارا قصہ بیان کئے دیتا هوں-یہ رقعہ اسے دینا-وہ تجھے ساری اونچ نیچ سمجھا دیگا اور تیرے کام میں مدد دیگا—

نظر یہ رقعہ لیکر بہت شکر و احسان کے ساتھہ رخصت هوا اور توکل بخدا مشرق کی طرف رخ کیا-کچھہ دنوں کے سفر کے بعد شہر سبکسار میں پہنچا-رقیب کے ملازموں نے جب دیکھا کہ ایک نیا آدمی شہر میں آیا هے تو اسے پکڑ کر اپنے آقا کے پاس لے گئے-اس نے پوچھا کہ تو کون هے؟ اور یہاں تیرا کیا کام هے؟ نظر نے دیکھا کہ معاملہ تیڑھا هے بات بنا کر جھٹ بولا کہ میں حکیم هوں اور میری حذاقت دور دور مشہور هے حکمت

کے تمام گروں میں ماہر ہوں-چاہوں تو مٹی کو سونا کر دکھاؤں-رقیب روپیہ کا بہت لالچی تھا یہ سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس کی ملاقات کو بہت غنیمت سمجھا-طمع نے فولاد کو موم کر دیا اور نظر سے سونا بنانے کی فرمائش کی-نظر نے جواب دیا کہ اس کے لئے چند دواؤں کی ضرورت ہے-شہر دیدار اور گلشن رخسار یہاں سے قریب ہے وہاں ہم تم مل کر چلیں گے اور دوائیں تلاش کریں گے-خدا نے چاہا تو سب کام ٹھیک ہو جائیگا-رقیب لالچ کا مارا اس کے جھانسے میں آگیا-دونوں مل کر شہر دیدار کی طرف چلے-غرض دونوں اس شہر میں پہنچے-قامت نے جو نظر کو رقیب کے ساتھ دیکھا تو چھپ کر اس کا حال پوچھا-نظر نے ہمت کا رقعہ قامت کو دیا قامت مضمون خط پڑھ کر بہت خوش ہوا-قامت کا ایک غلام تھا سیم ساق-اسے حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے نظر کو آنکھ بچا کر ایک طرف لے جا اور جا کر کہیں چھپا دے--

سیم ساق نے اسے فرش فرح بخش کے آسرے میں چھپا دیا-رقیب نے جب دیکھا کہ نظر غائب ہو گیا تو بہت جھلایا-اِدھر اُدھر تلاش کیا کہیں نہ پایا تو اپنی حماقت پر بہت افسوس کیا اور پریشان ہو کر اپنے شہر واپس چلا آیا-رقیب جب دفع ہوا تو نظر قامت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا بہت بہت دعائیں دیں-پھر کہا کہ مجھے شہر دیدار کی دھن لگی ہوئی ہے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا-اجازت دیجے-قامت نے بخوشی اجازت دی--

اب نظر قامت کو سلام کر کے رخصت ہوا اور شہر دیدار کی طرف چلا-بہزار دقت و محنت شہر دیدار نظر آیا-رخسار باغ میں پہنچا تو خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا-شہر دیکھا تو بہشت کا نمونہ پایا-دل باغ باغ ہو گیا-قضا کار حسن کی ایک سہیلی جس کا نام لٹ تھا عجب ناز و انداز سے اس باغ میں سیر کرتی ہوئی پہنچی-تپش سے بچکر سائے میں جو آئی تو یکایک اس کی آنکھ نظر پر پڑی-بیٹھی تھی تو ایک دفعہ ہی اٹھ کھڑی ہوئی-نظر سے پوچھا تو کون ہے اور یہاں تیرا آنا کیسے ہوا؟ اس باغ کا پتہ تجھے کس نے بتایا-یوں حیران و ششدر کیوں کھڑا ہے؟ یہ کیا ماجرا ہے؟ نظر نے آخر اپنا سارا حال من و عن بیان کیا اور بہت منت و عاجزی کی اور کہا کہ مجھ پر یہ بپتا پڑی ہے مصیبت زدہ ہوں یہاں تک آگیا ہوں-اب میری بات تیرے ہاتھ ہے--اس نے نظر کے عجز و الحاح کو دیکھ کر بہت مہربانی کی اور کہا غم نہ کر خدا پر بھروسہ رکھ-پھر اسے ساتھ لے گئی کچھ دنوں کے بعد رخصت کیا-چلتے وقت اپنے کچھ بال دئیے کہ جب تجھ پر کوئی مصیبت پڑے تو یہ بال آگ پر رکھ دینا میں فوراً تیری مدد کو آجاؤں گی--

لٹ سے وداع ہوکر نظر نے شہر دیدار کی طرف چلنے کا قصد کیا اور تھوڑی دیر میں رخسار گلزار کے ایک مقام پر پہنچا اور وہاں راحت و آرام پایا-اتنے میں

اس نے کچھ حبشی بچے دیکھے اور انہوں نے اسے دیکھا - نظر نے پوچھا تم کون ہو - کیا نام ہے اور کیا کام کرتے ہو؟ جواب دیا کہ حسن نازنین نے حبش سے ایک تل (لونڈی) بلائی تھی - تل بڑی ساحرہ ہے اور عاشقوں پر اس کا بہت ظلم ہے - ہم سب اسی کے غلام ہیں اور اس باغ کی نگہبانی کرتے ہیں چمن چمن میں پانی دیتے پھرتے ہیں - یہاں کے سب پھول پھل ہماری نگرانی میں ہیں —

نظر کا ایک بھائی تھا بہت خوش فہم اور زیرک وہ لڑکپن ہی میں جدا ہو گیا تھا اور کہیں چلا گیا تھا - غمزہ اس کا نام تھا - اتفاق ایسا ہوا کہ وہ حسن کی خدمت میں ملازم ہو گیا قسمت کی بات ہے کہ غمزہ اس گلزار میں مست پڑا تھا مگر ہوش حواس درست تھے سب پر نظر رکھتا تھا - جب اس نے نظر کو دیکھا تو اسے مطلق نہ پہچانا سمجھا کوئی بیگانہ ہے - اٹھ کر آیا اور نیام سے تلوار نکال کر اس کے سامنے آیا اور پوچھا تو کون ہے اور اس باغ میں کیوں آیا ہے؟ یہاں تیرا کیا کام ہے؟ یہ کہتے ہی اسے گرفتار کر لیا - آنکھیں باندھ دیں - کپڑے اتار لئے اور چاہتا تھا کہ سر قلم کر دے مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا - ان بھائیوں کی ماں نے دونوں کو دو لعل دئے تھے اور ان کے بازوؤں پر باندھ دئے تھے تاکہ کوئی وقت پڑے تو ایک دوسرے کو پہچان لیں - غمزے کی نظر جو نظر کے بازو پر پڑی تو لعل کو پہچان لیا - تب سمجھا کہ یہ تو اپنا بھائی ہے - بہت رویا گلے لگایا اور عذرخواہی کی اور کہا کوئی کیا کہ سکتا تھا کہ ہم بچپن کے بچھڑے ہوئے اس طرح ملیں گے - یہ خدا کی قدرت ہے - غمزہ نظر کو اپنے گھر لے گیا اور بہت خاطر تواضع کی —

حسن کو بھی اس کی اطلاع ملی کہ غمزے کا بھائی جو بچپن سے بچھڑا ہوا تھا آملا ہے - اس نے غمزے کو بلا کر اس کے بھائی کا احوال پوچھا کہ تیرے بھائی کا کیا نام ہے اور کیا کام کرتا ہے؟ غمزے نے کہا کہ میرے بھائی کا نام نظر ہے اور بہت کامل آدمی ہے - پھر پوچھا کہ کیا ہنر جانتا ہے اس نے کہا کہ جواہرات خوب پرکھتا ہے حسن کے پاس ایک عجیب و غریب جواہر تھا جس کی جوت سے سارا مکان روشن ہو جاتا - کہنے لگی کہ بہت دنوں سے اس سوچ میں تھی کہ کوئی جوہر شناس آئے تو اسے دکھاؤں - بارے الحمدللہ ایسا جوہر شناس آدمی آگیا - یہ سن کر غمزہ دوسرے روز نظر کو ساتھ لایا اور حسن کے حضور میں حاضر کر دیا - حسن کو نظر کی روش بہت بھائی - نظر نے سلام کیا - حسن نے جواب دیا - خزانہ دار کو بلایا اور اس لعل خوش رنگ کے حاضر کرنے کا حکم دیا - وہ دوڑا ہوا گیا اور تورت لیکر آیا - نظر نے جو اسے دیکھا تو عقل دنگ رہ گئی - اس جوہر میں جو بات تھی کہہ سنائی اور عرض کیا کہ یہ پاک صورت یہاں کیونکر آئی - اس صورت کا نام دل ہے - پھر سارا احوال کہ سنایا اور راز کی باتیں کھول کے بیان کر دیں - یہ حالات سنکر حسن کے دل پر ایسا

اثر ہوا کہ دل پر جان سے فریفتہ ہو گئی اور عشق کا جادو چل گیا —
اب نظر حسن کا بھی رازدار ہو گیا - کہنے لگی کہ جیسے تو نے مجھے دل پر عاشق کیا ہے اب اس کے ملنے کی بھی فکر کر - نظر نے کہا دل کا ہاتھ آنا بہت مشکل ہے - وہ اپنے جی کا مالک ہے کسی کا اسپر بس نہیں چلتا - دل اسی سے ملتا ہے جو دل ملانا جانتا ہے - جو دل سے دل ملانا جانتا ہے وہی دل کو پاتا ہے - تو نے جو دل سے دل لگایا ہے تو تجھے بھی زیبا ہے - دل کو بھی حسن بہت بھاتا ہے - لیکن دل کو تیرے پاس لانا آسان نہیں - خون جگر کھانا ہے - ایک بادشاہی میں خلل ڈالنا ہے - اسمیں جاں کا خطرہ ہے - عقل بادشاہ جو دل کا باپ ہے اس نے اسے تن کوٹ میں قید کر رکھا ہے - نہ کہیں آنے دیتا ہے نہ جانے دیتا ہے - دل اس بات سے بہت خفا ہے - لیکن بزرگ جو کرتے ہیں سوچ سمجھ کے کرتے ہیں - اس میں انہیں کا بھلا ہے - وہ بہت سعادتمند ہے ماں باپ کا بہت ادب کرتا ہے لیکن اے حسن اس درد کا درمان بھی تیرے ہاتھ ہے اس گھاؤ کا مرہم بھی تیرے ہی پاس ہے ایک زمانے سے دل کو آب حیات کی لگن لگی ہوئی ہے اور اس کی تلاش میں دیوانہ ہو رہا ہے - اگر تو میری مدد کرے اور کوئی معتبر آدمی میرے ساتھ دے تو آب حیات ڈھونڈھ کر لاؤں - پھر دل تیرے ہاتھ آجاتا ہے - دونوں کا مقصد پورا ہوتا ہے —
حسن کے پاس ایک غلام تھا جو پل بھر میں مشرق سے مغرب تک ہو آئے اور آسمان - زمین - عرش کرسی کی خبر لے آئے - تیزی میں ہوا اس کے سامنے گرد اور عقل و فراست میں اس کا نظیر نہ تھا - نام اس کا خیال تھا - حسن کے پاس یاقوت کی ایک انگوٹھی تھی جس سے آب حیات کے چشمہ پر مہر کی جاتی تھی - وہ اس نے خیال اور نظر کے حوالے کی اور کہا کہ یہ مہر نشانی لیکر جاؤ - دل کو دکھاؤ اور اسے جس طرح ہو سکے میرے پاس لاؤ —
خیال اور نظر حسن سے رخصت ہو کر تن شہر کو چلے کچھ مدت کے سفر کے بعد وہاں پہنچے - دل بادشاہ کے دیدار سے مشرف ہوئے اور تمام حقیقت بیان کی اور دل کو خوشخبری دی - دل نے نظر کو بہت سرافراز کیا اور اس کی ہمت پر بہت آفریں کی - انگوٹھی کو چوما سر آنکھوں پر رکھا سارا دن اور ساری رات وہی باتیں کرتا رہا اور ذرا نہ اکتایا - خیال کی بھی بہت خاطر مدارات کی اور پوچھا کہ تم کیا کام کرتے ہو - اس نے کہا میں نقاش ہوں صورت نویسی میں شہرۂ آفاق ہوں دل نے کہا اچھا میں بھی ذرا تیرا ہنر دیکھوں - خیال نے قلم ہاتھ میں لی اور فوراً حسن کی صورت کھینچ کر دکھا دی - دل یہ صورت دیکھ کر دل و جان سے عاشق ہو گیا اور سدھ بدھ کھو بیٹھا - حالت نازک ہو گئی خواب و آرام حرام ہو گیا - صبر و قرار ہاتھ سے جاتا رہا - بس دن رات حسن ہی کی دھن رہنے لگی —

آخر خیال اور نظر سے مشورہ کر کے دل نے شہر دیدار کا عزم کیا۔اس وقت دل کا وزیر وھم نامی تھا۔جب اس نے سنا کہ دل جانا چاھتا ھے تو اسے بڑی فکر ھوئی اور سمجھا کہ وہ خیال اور نظر کے جھانسے میں آکر اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی مارنا چاھتا ھے۔ملک خراب ھو جائیگا اور رعایا برباد ھو جائیگی۔اس نے فوراً بادشاہ عقل سے ساری باتیں جا لگائیں کہ نظر جو شہر سے غائب تھا ایک خانہ خراب خیال کو ساتھ لایا ھے اور دونوں مل کر شہزادۂ دل کو شہر دیدار کی طرف لیجانا چاھتے ھیں۔یہ ضرور کوئی فتنہ پیدا کریں گے اور ملک میں خلل ڈالیں گے۔جو تدبیر کرنی ھو جلد کر لیجئے ورنہ وقت ھاتھ سے نکل جائیگا۔میری بات مانئے۔ورنہ اس کا نتیجہ یہ ھوگا کہ عشق بادشاہ آپ سے لڑے گا اور سلطنت میں ابتری پڑ جائیگی۔ابھی اس سے صلح ھوئی ھے۔قول قرار ھوئے ھیں۔باھم اخلاص و محبت ھے۔اس کے بعد جھگڑا ھوا تو برا ھوگا۔عشق بادشاہ بہت قوی ھے اس کا مقابلہ آسان نہیں۔ایک جان نثار اور وفادار بندے کا فرض ھے کہ وہ آقا کو اونچ نیچ سمجھادے۔اس موقع پر چپ رھنا نمک حرامی ھے۔عقل بادشاہ نے یہ سن کر وھم کو گلے لگا لیا اور اس کی خوش فہمی اور وفاداری سے بہت خوش ھوا اور کہا کہ جو کچھ تو نے کہا ھے وہ سب درست اور معقول ھے اور فوراً لشکر بھیج کر دل اور نظر کو قید کرنے کا حکم دیا۔

یاقوت کی وہ انگوٹھی جو حسن نے دل کو اپنے عشق کی نشانی بھیجی تھی وہ کسی مصلحت سے دل نے نظر کو دیدی تھی۔اس میں ایک یہ خاصیت تھی کہ جو کوئی اسے منہ میں رکھ لے تو سب کی نظروں سے اوجھل ھو جائے۔وہ سب کو دیکھے اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔چنانچہ اس انگوٹھی کو منہ میں رکھ کر عقل بادشاہ کے بند سے باھر نکل آیا اور شہر دیدار کی طرف روانہ ھوا اور جلد جا پہنچا۔سیر کرتے کرتے رخسار کے گلزار میں گزرا۔وھاں ایک چشمہ جسے آب حیات کہتے ھیں پا یا۔لالچ میں آکر چاھتا تھا کہ ایک گھونٹ پانی پی لے کہ وہ انگوٹھی منہ میں سے نکل کر چشمے میں جا پڑی۔آب حیات کا چشمہ نظر سے غائب ھو گیا۔بہت پچھتایا بہت رنج و ملال کیا مگر کیا ھو سکتا تھا۔اتنے میں رقیب کی نظر اس پر پڑی وہ تو تاک میں تھا ھی فوراً پکڑ لیا اور جکڑ کر باندہ لیا اور اپنے گھر لیجا کر قید کر دیا۔یہ اپنے کئے کا پھل تھا۔بیوفائی کا نتیجہ تھا۔چندے اس قید میں بسر کی بہت پریشان حال رھا۔کوئی تدبیر رھائی کی نظر نہ آتی تھی۔ایک روز یاد آیا زلف (لٹ) نے جو بال دئے تھے ان سے کام لینا چاھئے۔ایک دو بال لے کر فوراً آگ پر رکھے۔بالوں کا آگ پر رکھنا تھا کہ فوراً زلف آپہنچی اور پوچھنے لگی کہ کیا گزری جو مجھے یاد کیا۔کہنے لگا پوچھتی کیا ھو جس حال میں ھوں دیکھ لو۔زلف نے کہا غم نہ کھا ھمت بلند رکھ۔مصیبت مردوں پر ھی آتی ھے۔غرض زلف نے اسے حکمت سے باھر نکالا اور

قید سے ازاد کیا اور رخسار کے گلزار اور شہر دیدار کے رستے پر ڈال دیا۔نظر وہاں پہنچ کر حسن سے ملا۔حسن دل کے فراق میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔جب نظر کی زبانی تمام حال معلوم ہوا تو بہت مغموم اور مایوس ہوئی اور غمزہ کو بلاکر کہا کہ تم اور نظر دونوں مل کر جاؤ اور جس طرح بن پڑے تدبیر سے حکمت سے جادو ٹونے سے دل کو یہاں لیکر آؤ—

غرض نظر اور غمزہ چیدہ اور تجربہ کار آدمیوں کو اپنے ساتھ لیکر شہر تن کی طرف سدھارے اور سو منزل کی ایک منزل کر کے بھاگا بھاگ وہاں پہنچے۔کہتے ہیں کہ نظر جس وقت عقل کے بند میں سے نکل بھاگا تھا تو عقل کو اسی وقت کھٹکا ہوا کہ یہ جاکر کچھ نہ کچھ فتنہ برپا کریگا۔اس لئے اس نے پہلے ہی سے سرحد کے سرداروں کے نام احکام جاری کردئیے تھے کہ نظر قید سے بھاگ گیا ہے اسے ملک سے باہر نہ جانے دیں۔زہد و رزق کا ایک پہاڑ تھا وہاں رزق کا بیٹا توبہ رہتا تھا۔اسے خاصکر اس کام پر متعین کیا تھا کہ نظر کو سرحد سے باہر نہ جانے دے۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ غمزہ اور نظر دونوں بے خبر رات کے وقت اسی پہاڑ کے تلے پہنچے۔اس پہاڑ کے دامن میں ایک پھول باڑی تھی وہاں آرام کیا۔جگہ بہت سہانی۔رات کے جاگے ہوئے تھے خوب نیند آئی—

اتنے میں سورج نے پردۂ شب سے سر نکالا اور دنیا میں اجالا ہوا۔ابھی پاؤ پاؤ گھڑی دن بھی نہیں چڑھا تھا کہ قلعہ کے دیدبان نے دیکھا کہ نظر لشکر لئے پڑا ہے۔حیران ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔فوراً توبہ سے آکر سارا ماجرا بیان کیا۔توبہ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور فوراً لشکر لے کر نظر اور غمزے پر جاپڑا۔شور و غل سن کر نظر اور غمزہ اور ان کے ساتھی یکبارگی آنکھیں ملتے ہوئے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے سامنے فوج دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔گرتے پڑتے اٹھے۔دشمن نظر اور غمزے پر آکر ٹوٹے۔یہ دونوں بڑے بہادر تھے۔بڑی دلیری اور بے جگری سے لڑے اور توبہ کو مار بھگایا۔رزق کا جو صومعہ تھا اسے بھی توڑ پھوڑ ڈالا۔وہاں سے عافیت کے شہر کی طرف چلے۔دونوں بھیس بدل کر قلندر بن گئے اور شہر عافیت پہنچ کر ناموس بادشاہ سے ملاقات کی۔ناموس بادشاہ عاشق مزاج تھا۔پہلے ہی سے جلا بھنا بیٹھا تھا دونوں کو دیکھتے ہی مال دولت چھوڑ کر فقیر ہو گیا اور ان کے ہاتھ میں اسیر ہوا۔اب چلتے چلتے شہر بدن کے قریب پہنچے۔قلندری بھیس اتارا اور اصلی کپڑے پہنے۔غمزہ اس وقت شراب کے نشے میں تھا۔اس نے اپنے لشکر پر ایسی سیفی پڑھ کر پھونکی کہ سب لشکری ہرن بن گئے—

ادھر توبہ غمزے سے شکست کھا کر شہر بدن میں پہنچا اور عقل بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔آداب بجالایا اور جو کچھ اس پر ظلم و بیداد ہوئی تھی

کہ سنا دی- بادشاہ نے جب غمزے کی یہ صفائی دیکھی تو دل کو طلب کیا- قید سے رہا کیا- غمزے کی بیدادی کا قصہ سنایا اور کہا کہ حسن کا لشکر بہت بیداد ہے اس میں وفا نہیں- تم اگر ان دغابازوں کی باتوں پر جاؤگے تو اپنا ملک کھو کے رہو گے- اگر تمھیں حسن کی ایسی ہی لو لگی ہے اور اس کے وصال کے شوق میں جنوں ہے تو ہماری بات سنو- تم ہمارا جرار لشکر لے کر شہر دیدار کے ادھر چلے جاؤ- اکیلے جانا خطر سے خالی نہیں- عورت کی ذات بہت مکار ہوتی ہے- نہ معلوم اس عشق کے حیلے میں کیا گل کھلائے- دل کو بھی یہ بات بہت پسند آئی اور باپ نے جو کہا تھا بسر و چشم قبول کیا- ہمت کے گھوڑے پر سوار ہوا- شاہ عقل کے سپہ سالار صبر کو ساتھ لیا- سب لشکر دیکھا- موجودات لی اور شہر دیدار کا رخ کیا- عقل نے دیکھا کہ میری بات دل کے لئے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوئی تو وہ چند منزل اسے پہنچا نے آیا اور مہر و محبت سے تجربہ اور کام کی باتیں اس کے کان میں ڈالتا رہا- تھوڑی دیر چلے تھے ساتھ والے خبر لائے کہ اس جنگل میں جگہ جگہ ہرن چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں گویا ہوا سے باتیں کرتے ہیں- مگر ایسے ہشیار اور سمجھدار ہیں گویا آدمی ہیں- چال ڈھال سب ویسی- البتہ باتیں نہیں کرتے- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنات نے ہرنوں کا بھیس بدل لیا ہے- دل یہ سن کر بیتاب ہوگیا- شکار کا شوق سر پر سوار ہوا- اس پر جوانی کا ولولہ- تیر کمان لے ہرنوں کے پیچھے گھوڑا ڈالا- وہ اصل میں ہرن نہ تھے وہی غمزے کا لشکر تھا انہیں کون پکڑ سکتا تھا- دور نکل جاتے تو ٹھیر جاتے اور جو دل قریب آتا تو قلانچیں بھر کے آگے نکل جاتے- اس طرح دل اور عقل دونوں کو اپنے پیچھے لگائے لے گئے- عقل تھک کر رہ گیا لیکن دل دیوانوں کی طرح جنگل میں بڑھتا چلا گیا- عقل کی محبت نے جوش مارا اور وہ بھی اسی طرف راہی ہوا- دونوں ہرنوں کے پیچھے سرگرداں چلے اور ہوتے ہوتے دور نکل گئے- اب نظر اور غمزے نے آپس میں مشورہ کیا کہ کسی طرح دل کو شہر دیدار کے قریب لے جائیں پھر جو ہو سو ہو- ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ملک میں آتا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے- اب معاملہ قسمت کے ہاتھ میں ہے- غرض اس طرح بہلاتے پھسلاتے شہر دیدار کے قریب لے آئے اور اپنی اس کامیابی پر بہت خوش ہوئے اور حسن کی خدمت میں حاضر ہو کر تسلیمات بجالائے- وہ بھی انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور گلے لگا لیا- بہت کچھ انعام و اکرام دیا—

لیکن اب اس سوچ بچار میں پڑے کہ عقل بادشاہ جو لشکر لئے چلا آ رہا ہے اس کی کیا تدبیر کی جائے اور اس آفت کو کیونکر ٹالا جائے- رائے یہ قرار پائی کہ حسن اپنے باپ کو اطلاع کرے تاکہ وہ اس لشکر کے دور کرنے کا کوئی جتن کرے- چنانچہ اس نے اپنے باپ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ میرا ایک وفادار خوش فہم غلام خیال نامی

مدت سے غائب تھا۔اب یہ معلوم ہوا کہ عقل بادشاہ نے گرفتار کر لیا ہے۔نہ اسے کھانے کو دیتا ہے نہ پہننے کو اور نہ ادھر آنے دیتا ہے۔ہم نے بلا بھیجا تو بہت برہم ہوا اور اب لشکر لئے چڑھا آرہا ہے۔چاہتا ہے کہ شہر دیدار فتح کرے اور اس گلزار پر قبضہ جمائے۔رعایا کو تباہ کرے۔عشق نے جب مکتوب پڑھا مارے طیش کے چہرہ لال ہو گیا اور کہا کہ عقل کی یہ مجال کہ وہ اس سر زمین میں قدم رکھے۔اگر عقل کو اپنے اوپر گھمنڈ ہے تو کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ میں بھی عشق ہوں۔عقل دیوانہ ہے جو عشق سے بھڑنا چاہتا ہے —

غرض عشق نے اپنے بہادر اور مستعد سپہ سالار مہر نامی کو مقابلے کے لئے بھیجا۔اس نے حسب فرمان جہاں پناہ لشکر جرار جمع کیا۔عقل یہ فوج دیکھ کر بہت ست پٹایا اور کہنے لگا کہ فرزند کی نالایقی سے آفت باپ پر آتی ہے۔اپنے اس فعل پر بہت پچھتایا۔اتنے میں لڑائی شروع ہو گئی۔غمزے نے عقل پر حملہ کیا۔خوب دو دو ہاتھ ہوئے۔عقل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔دوسرے روز قامت نے عقل کے لشکر میں قیامت برپا کر دی۔تیسرے دن رات کو زلف نے شبخون مارا۔سوتے ہوؤں کو پچھاڑا اور سارے لشکر میں کھلبلی مچادی۔اتنے میں پاس آئی۔دل میں اور اس میں بہت محبت تھی۔اس نے دل سے کہا تو رو نہیں میں تمہاری مدد پر ہوں۔لیکن کام بہت کٹھن ہے۔بھاگنا نامردی ہے۔اب سوائے مرنے مارنے کے کوئی چارہ نہیں مردی کا یہی وقت ہے۔دل نے کہا مجھے تجھ سے بہت توقع ہے۔میں بھی دل ہوں لڑنے مرنے میں ثابت قدم ہوں۔مگر حسن و عشق کا لشکر بہت قوی ہے۔چیونٹیوں کی ہاتھی سے لڑائی ہے۔لیکن رن چھوڑنا عاشقوں کو زیبا نہیں۔یہ کہ کر اس نے دو چار خوب زور کے حملے کئے۔عشق کے لشکر کو تہ و بالا کر دیا۔چوتھے دن بھی یہ ہی آفت برپا رہی۔دونوں لشکر برابر اڑے رہے۔نہ کسی کی جیت ہوئی نہ کسی کی ہار—

حسن کو جب یہ خبر پہنچی بہت گھبرائی۔اپنے خال سے مشورہ کیا۔اس نے کہا کوہ قاف کی پریوں میں تیری ایک ہمزاد ہے۔تجھ سے اسے بہت اخلاص پیار ہے۔بہت ہشیار اور دلیر ہے۔شکل صورت میں بھی لاجواب ہے۔اس کا نام بھی حسن ہے۔تم دونوں نازنین صاحب جمال۔دو چاند۔دو سورج ہو۔اگر تم اور وہ مل کر کام کرو تو عقل پر فتح پانا کوئی بات نہیں۔دل تو خود عاشق ہے۔صرف باپ ہی کو رام کرنا ہے۔حسن نے کہا وہ کوہ قاف میں۔میں یہاں۔اس کے آئے آئے تو یہاں کام تمام ہو جائیگا۔خال نے کہا یہ کوئی مشکل نہیں۔میرے پاس عنبر کا دانہ ہے۔جس وقت اسے آگ پر رکھونگا۔تیری ہمزاد چٹکی بجاتے تیرے پاس آجائیگی۔یہ سنکر بہت خوش ہوئی۔خال نے عنبر کا دانہ آگ پر رکھا اور حسن کی ہمزاد کو اس کے حضور میں حاضر کیا۔حسن یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔گلے ملی

بہت خاطر مدارات کی رات باتوں باتوں میں عقل اور دل کے لشکر کا حال بیان کیا اور اپنے عشق و محبت کا قصہ دھرایا اور کہا کہ دل بیچارا باپ کی وجہ سے جھگڑے میں آپھنسا ھے۔وہ عاشق ھے اسے ان باتوں سے کیا غرض۔یہ مشکل آپڑی ھے۔کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔حسن کی ھمزاد نے سوچ بچار کے بعد کہا۔درست۔عقل کی کیا حقیقت ھے۔مہر عشق کا سرلشکر سب پرور تھا۔حسن کی ھمزاد نے اپنا ناز۔غمزہ۔شیوہ۔نخرا اس کی مدد کو بھیجا۔حسن کے پاس بھی ایک باکمال تیرانداز تھا۔جس کا نشانہ کبھی خطا نہوتا۔اس کے کمال کی دور دور شہرت تھی۔اس کا نام ھلال کماندار تھا۔اسے بھی حسن نے سپہ سالار کی کمک پر بھیجا۔جب یہ کماندار پہنچا تو عشق کا پاہ بہت بھاری ھوگیا۔ھلال عقل کے لشکر پر جاپڑا۔چاروں طرف سے اسپر مار پڑی۔وہ ھمت نہ ھارا گھسا چلا گیا۔یکبارگی دل کے پاس جاپہنچا اور انجان بنے سے ایسا تیر جوڑ کر مارا کہ دل کے پار ھو گیا۔مارنا چاھتا تھا کسے اور لگ گیا کسے۔آدمی ھرچند ھوشیاری کرے۔قضا پر بس نہیں چلتا۔عقل نے جب دل کو گھوڑے پر سے گرا دیکھا تو حواس جاتے رھے۔سینہ شق ھو گیا عقل کا لشکر یہ ماجرا دیکھ کر فرار ھو گیا اور کوئی باقی نہ رھا۔عقل بیچارا مارا مارا پھرا۔کہیں ٹھکانا نہ ملا۔کوئی کہتا شہر بدن کو چلا گیا کوئی کہتا مارا گیا۔غرض کچھ پتہ نہ چلا——

ادھر فتح کے شادیانے بجنے لگے۔سارے شہر میں جشن ھونے لگے۔حسن ھزار ھزار شکر بجا لائی۔عقل کو پاس نہ دیکھ کر دل کو حسن کے خدمتگاروں نے پکڑ لیا اور باندھ کر حسن کے پاس لائے۔حسن کی نظر اس پر پڑی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل سے آہ نکلی۔بیتاب ھو گئی۔محبت کی آگ سے تن من جل گیا۔مارنے والے کو ھزاروں کوسنے دئیے۔میں نے کب کہا تھا کہ اس کو یوں گھائل کرو۔یہ نمک حرام کچھ سمجھتے نہیں۔جب ذرا دل کو قرار ھوا۔ھوش حواس درست ھوئے تو اپنی دائی کو بلایا جو آفت کا پرکالا تھی۔اس کا نام ناز تھا۔اسے اپنی درد بھری داستان سنائی اور صلاح پوچھی کیا کروں۔مجھ سے اب رھا نہیں جاتا۔وہ بھی بیتاب میں بھی بیتاب۔ملنے کی کیا صورت ھو۔ایسا نہو کہ خلق میں رسوائی ھو۔میری رائے میں یہ آتا ھے کہ مہر سپہ سالار کو عشق کے حضور میں بھیجوں اور اس کے ذریعہ سے عقل کے فرار اور اپنی فتح کی خبر سناؤں۔دیکھیں وہ کیا کہتے ھیں۔ناز دائی نے اس تدبیر اور عقل کی بہت تعریف کی۔غرض مہر نے جاکر فتح کی خبر سنائی۔عشق یہ سنکر عقل پر بہت ھنسا اور کہا کہ یہ بڑا نالایق ھے کہ ایسے جھگڑوں میں پڑتا ھے۔یہ عقل دیوانہ ھے جو عشق سے بھڑنا چاھتا ھے۔اسے عشق اور حسن کے کاموں میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر بھاگنا پڑا نہ۔اب زلف سے کہو کہ دل کے گلے میں حلقے کا طوق ڈالے اور تاروں کی زنجیروں سے جکڑ کر رکھے۔عقل بہت فتنہ پرداز ھے۔

ناز-غمزے-شیوے-عشوے سے کہنا کہ ذرا ھشیار رھیں—

نازدائی نے یہ ساری کیفیت حسن کو آسنائی اور کہا کہ اس معاملے میں جلد نہیں کرنی چاھئے-جلدی سے کام خراب ھوتاھے-اب اس عاشق(دل)کو کسی حکمت دوسری جگہ رکھیں اور ملنے کی تدبیر کریں-جلدی میں رسوائی کا ڈر ھے-مناسب یہ ھوگا کہ رخسار کے گلزار میں ایک کنواں ھے جو کچھ سونے سے تیار کیا گیا ھے او اس کا سواد بھی بہت سہانا ھے-فی الحال اسمیں بند رکھا جائے-عشق کے راز کو فاش کرنا مصلحت نہیں-دل بیچارا یہاں گرفتار تھا اور اس امید میں تھا کہ شاید میر عشق زور کرے اور حسن کو میرے حال پر رحم آئے-ادھر حسن بیقرار تھی او فراق یار نے انگاروں پر لٹا رکھا تھا-کھانا-پینا-سونا حرام ھو گیا تھا—

سپہ سالار مہر کی ایک بیٹی تھی وفا نام-وہ حسن سے بہت محبت رکھتی تھی اسے بلا کے اپنی بیتابی کا سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ ملنے کی کوئی تدبیر کر-وہ میرے خیال میں ایک بات آئی ھے کہ شہر میں ایک باغ ھے-باغ کیا ھے اس عالم سنگار ھے-عاشق کی جان ھے-اس میں چشمۂ آبحیات ھے اور باغ کے بیچوں بیچ ایک چھجا ھے-اس چھجے پر غمزے کے بادل چھائے رھتے ھیں اور ناز کے موتی برستے رھتے ھیں-اس چھجے میں بڑی بڑی دو کالی کالی کھڑکیاں ھیں-جو ان دو کھڑکیوں کو کھولے وصل کی لذت پائے-دل کو چوری چھپے اس چھجے پر لانے کی فکر کرنی چاھئے-حسن نے کہا کیا تو اسے لا سکتی ھے-تجھ میں اتنی قدرت ھے؟ اس نے کہا انشاالله اگر میری عقل میرے ساتھ ھے تو اسے یہاں لا کر پہنچادونگی-اول مجھے یہ بتا وہ ھے کہاں؟ پھر اس سے مل کر اس کے دل کا بھید پاؤنگی اور جہاں تو کہیگی وھاں لاؤنگی-حسن نے زلف کو حکم دیا کہ دل کے پیچ سب کھول دے اور اسے چاہ ذقن سے باھر نکال اور اس کے پاؤں کی گرد اپنے بالوں سے جھاڑ اور دلکشا باغ میں لا کر پہنچادے-زلف بڑے ناز و انداز سے اکڑتی لچکتی گئی اور دل کو چاہ ذقن سے نکال باھر لائی-اتنے میں وفا بھی آپہنچی-دل سے گھل مل کے باتیں کرنے لگی-بہت کچھ دلاسا دیا اور کہا کہ حسن نے جو تجھے بند رکھا تھا اس میں مجبوری تھی-باپ کا ڈر اور لحاظ تھا-اگر ایسا نکرتی تو تیری جان کے لالے پڑ جاتے-حسن نے تیرے ساتھ بڑی مروت و عنایت کی-تجھے اس کی قدر کرنی چاھئے-مرد بڑے بے وفا او بے مہر ھوتے ھیں-عورت کی محبت کی قدر نہیں کرتے-عورت بیچاری بھولی بھالی ان کے داؤں میں آجاتی ھے-غرض اس طرح کی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کے دل کو موہ لیا اور محبت کی گرمائی سے گرمایا-کنوئیں سے نکل کر باغ میں آیا تو بہت خوش ھوا-بہت دنوں کا تھکا ماندہ تھا-وھیں پھولوں کی کیاری پر پڑ کے سو رھا وفا نے جاکر حسن کو خبر دی کہ دل کی آنکھ لگ گئی ھے-اب تیری مراد بر آئی

یہ سنکر حسن مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی۔ ہوا کی طرح اڑ کے آئی۔ دیکھا کہ دل کا قرار۔ جی کا آرام دل پڑا سو رہا ہے۔ سرہانے ہاتھ رکھے پھولوں پر آرام کر رہا ہے۔ اور سارے باغ میں اس کے حسن کی جوت ہے۔ معلوم ہوتا ہے گویا چودھویں رات کا چاند اتر آیا ہے۔ دل کی صورت دیکھ کر حسن کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کے پاؤں پر آنکھیں ملیں۔ بلائیں لیں اور اس کا سر اپنی گود میں لے کے بیٹھ گئی۔ مگر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ چند قطرے دل کے رخسار پر گرے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ حیران تھا کہ باغ میں دفعتاً بہار کہاں سے آگئی اور یہ سہانا پن کیونکر پیدا ہو گیا کہ سارا چمن نور کا عالم ہے۔ آنکھ اٹھا کے دیکھا تو دوسرا ہی عالم نظر آیا۔ دل سے آہ نکلی۔ بے قرار ہو گیا۔ محبت کے جوش میں دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور پھر بھینچ بھینچ کے گلے ملا۔ اب گلے شکوے اور راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں۔ اس کے بعد حسن نے کہا کہ تیرے عشق نے بیتاب کر دیا اور یہاں کھینچ لایا۔ جان سے ہاتھ دھو کر یہاں آئی ہوں۔ اب اجازت دے۔ جاتی ہوں۔ وصال کی تدبیر کرتی ہوں یا تجھے بلا بھیجتی ہوں یا خود تجھے لینے آؤنگی برا نہ مان اور میری مصلحت کو پہچان —

وفا اور ناز نے چھجے پر کی مجلس آراستہ کی۔ نظر اور خیال اور تبسم اس باغ کے پانی کے چشمے پر صحبت رکھتے تھے۔ حسن بیتاب اور بے صبر ہو کر پہنچی اور وفا کو الگ بلا کر منت کرنے لگی کہ خیال۔ نظر اور تبسم سے کہو کہ دل کا دل ہاتھ میں لیں اور اسے داروے بیہوشی پلائیں اور زلف سے کہو کہ دل کو اس چھجے پر اس طرح لیکر آئے کہ اسے بھی خبر نہ ہو۔ اپنے کو جانے نہ دوسرے کو پہچانے خیال اور نظر اور تبسم نے حکم کی تعمیل کی۔ داروے بیہوشی سے دل کو بے خبر اور بے سدھ کیا اور زلف اسے چھجے پر اس طرح اٹھا لائی کہ دل کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ جہاں تھا وہیں ہوں۔ اب کیا تھا حسن کی خوشی اور مسرت کی کوئی حد نہ رہی۔ خوب گھل مل کے باتیں کیں اور اپنے ارمان نکالے۔ غرض اس طرح روز حسن دل کو بالا خانے پر لاتی اور مزے اڑاتی —

آخر یہ چوری کب تک چھپتی۔ رقیب روسیاہ کی ایک بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا جو حسن کے پاس رہتی تھی۔ ظاہر میں دوست تھی پر دل میں اس کے کھوٹ تھا۔ اسے اس کا جلاپا تھا کہ حسن اکیلے اکیلے جاتی ہے مجھے ساتھ نہیں لے جاتی۔ اس لئے اس کے درپے ہو گئی کہ دیکھوں میرے ہاتھ سے کیونکر بچتی ہے۔ ایک رات جب حسن دل سے ملنے گئی تو یہ چوری چھپے سے اس کے ساتھ ہو لی اور بالا خانے پر ایک کونے میں چھپ کے بیٹھ رہی اور ان کے راز سے واقف ہو گئی۔ دل کو دیکھ کر وہ بھی اس پر ریجھ گئی اور کہنے لگی میں کیا حسن و جمال میں حسن سے کم ہوں۔ میں بھی دلربا اور محبوب ہوں۔ ناز و غمزہ میں اس سے کم نہیں۔ میں

دل موهنا جانتی هوں۔میں بھی انداز دلربائی کی گھاتوں سے واقف هوں——

ایک شب حسن شہر گئی تو کسی وجه سے اس کا آنا نه هوا۔موقع پاکر وصال کے بالا خانے پر چڑھ گئی۔جادو ٹونے میں کمال رکھتی تھی۔حسن کی صورت بنا کر بیٹھه گئی۔خیال اور نظر اور تبسم اور وفا کو جس طرح حسن حکم دیتی تھی اسی طرح اس نے بھی حکم دیا۔چنانچه دل کو داروے بیہوشی پلا یا گیا اور زلف اسے جوں توں وصال کے بالاخانے پر لائی۔اتنے میں خیال جو سورها تھا جاگا دل کو دیکھا تو کہیں نه پایا بہت پریشان هوا۔ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے وصال کے بالاخانے پر پہنچا تو دیکھا که غیر دل کی گود میں مست پڑی هے اور دل بے خبری کے عالم میں هے۔ خیال فوراً شہر دیدار کو گیا اور گلزار میں جاکر جو کچھه دیکھا تھا حسن سے بیان کیا۔یه سن کر حسن کے هوش جاتے رهے۔تن بدن میں آگ لگ گئی۔جیسے بیٹھی تھی اٹھه کھڑی هوئی اور حسد کی آگ میں جلتی بھنتی وصال کے بالاخانے پر آئی۔ غیر اور دل کو ایک جگه دیکھه کر آپے سے باهر هوگئی اور لگی غیر کو کوسنے اور گالیاں سنانے اور ایک قیامت برپا کردی۔غیر هکا بکا رہ گئی۔جادو کے زور سے بھیس بدل حسن کی نظروں سے چھپ گئی اور وصال کے بالاخانے سے اتر نیچے آئی اور شہر سبکسار کی طرف روانه هوئی۔حسن دل پر بھی سخت برافروخته هوئی اور اس کی بے وفائی اور بے مہری سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے هوگیا اور طیش میں آکر خیال۔نظر اور تبسم کو حکم دیا که اس نالائق۔بے وفا۔مرکھه کو باغ سے باهر نکال دو۔وہ عورت کم عقل۔احمق تھی۔یه مرد تھا یه کیوں پھسل پڑا۔میں اس کی خاطر سارے عالم میں بدنام هوئی اور یه ایسا بے وفا نکلا——

غیر نے ادھر تو حسن اور دل سے یه فریب کیا اور ادھر اپنے باپ رقیب سے جا لگائی۔وہ یه ماجرا سن کر بہت برافروخته هوا اور شہر دیدار میں آیا اور دل کی تلاش شروع کی۔آخر اسے حسن کے بندی خانے میں پایا۔جادو اور ٹونے میں کمال رکھتا تھا۔خیال اور نظر اور تبسم پر کچھه دانے پڑھ کر پھینکے۔یه تینوں دیوانے هوگئے اور دل کو بندی خانے سے نکال شہر سبکسار کو لے گیا۔وهاں ایک کوٹ هجر نام کا تھا۔اس میں قید کر دیا۔یہاں بیچارہ دل اتنا پریشان هوا که جینے سے بیزار هو گیا اور اپنے کئے پر بہت پچتایا اور اپنے حال پر بہت تاسف کیا۔تمام حالات سے بے خبر جی هی جی میں کہتا تھا که مجھسے کون ایسا قصور هوا تھا که حسن نے یه ستم مجھه پر ڈھایا۔آخر مجھسے پوچھنا تو تھا که میں نے کیا خطا کی۔یه کیا انصاف هے که دوسرے کے کہنے سننے سے مجھے زندہ درگور کر دیا۔میں نے برا کیا جو ایسی جگه دل لگایا۔عورت بھی عجیب بلا هے۔خدا اس سے پناہ میں رکھے۔غرض ان باتوں پر غور کرتا اور دل هی دل میں کڑھتا——

حسن کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ الگ بیتاب اور مضطر ہوئی۔اخر میں بھی دل کے حال پر ترس آیا اور اس نے حسن کو ایک رقعہ لکھا کہ تو جس قدر مجھہ پر غصہ کرے بجا ہے۔اصل میں میری خطا ہے۔دل بیچارہ بے گناہ ہے۔میرا دل اس پر آیا اور میں تیری صورت بنا کر اس سے ملی۔اسے کیا خبر تھی کہ یہ دغا بازی ہے۔ بے خبر اور مست پر پاداش لازم نہیں۔وہ عاشق صادق ہے اس پر غصہ درست نہیں میں تیری بھی قصوروار ہوں اور دل کی بھی۔یہ فراق میرا ڈالا ہوا ہے۔تو اپنی مروت سے معاف کر۔(وغیرہ وغیرہ) اس رقعے کا مضمون پڑہ کر حسن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ہوش و حواس جاتے رہے۔بال نوچنے لگی اور سینہ کوٹنے لگی اور اپنے فعل پر بہت نادم ہوئی۔اسی وقت دل کو اشتیاق بھرا خط لکھا جس میں اپنے فراق اور غیر کی شکایت لکھی اور ہزاروں قسمیں دیکر اپنی بے گناہی کا یقین دلایا۔خیال کے ہاتھہ یہ رقعہ دل کو بھیجا۔جب یہ نامۂ شوق دل کو پہنچا تو وہ بھی بیتاب ہوگیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔غیرکو بہت برا بھلا کہا کہ یہ سارا فساد اس حرام خور کا ہے۔حسن اس میں بے قصور ہے۔اس کے جواب میں رقعہ لکھا کہ اس میں تیرا قصور نہیں۔قصور سراسر میرا ہے۔یہ سارا بیج بویا ہوا غیر کا ہے۔میرا دل تجھہ سے صاف ہے۔وہی محبت وہی چاہ ہے۔اگر تو مجھے داروے بیہوشی نہ پلایا کرتی تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔خیر جو ہوا سو ہوا—

اب دوسری طرف کا حال سنئے کہ عقل بادشاہ شکست کھا کر شہر بدن (تن) میں آیا۔مارے شرم کے کہیں چھپ رہا اور صبر جو عقل کا سر لشکر تھا وہ عشق کے لشکر سے بھاگ کر شہر ہدایت میں آیا اور ہمت سے کہا کہ دل زخمی ہوکر حسن کے ہاتھہ گرفتار ہوا اور عقل شکست کھا کر نہ معلوم کہاں غائب ہوگیا ہے۔یہ قسمت کا لکھا تھا جو ہوا۔ہمت نے بہت رنج و افسوس کیا اور کہا کہ عقل کا مجھہ پر بہت حق ہے۔شرط دوستداری یہ ہے کہ اب عقل اور دل کی خبر لوں اور انہیں تسلی دوں۔نہ معلوم ان بدنصیبوں کا کیا حال ہے اور ان پر کیا گزر رہی ہے۔اس وقت یاری اور دستگیری کا وقت ہے۔ہمت نے یہ کہہ کر تلوار ہاتھہ میں لی اور اپنا لشکر مستعد کیا اور شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا۔رستے میں جہاں جہاں پہنچتا عقل اور دل کا حال پوچھتا جاتا۔چلتے چلتے قامت کے بوستان میں آیا۔بھائی سے عقل اور دل کا احوال پوچھا۔قامت نے کہا اے ہمت تونے خوب کیا تجھہ پر ہزار رحمت۔سچے اور وفادار آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں۔آج ایک سال ہوتا ہے کہ دل ہجراں کے کوت میں پڑا ہے اور عقل شہر تن کو گیا ہے۔عشق کا لشکر بے شمار ہے۔اس سے جیتنا مشکل ہے۔اس سے مل کے رہنے ہی میں مصلحت ہے۔اس سے لڑنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ خود خراب۔گھر خراب۔ملک خراب اور رعایا الگ پریشان۔اب صرف ایک تدبیر ہے

ی دو سمجھا بجھا کر کسی طرح منانا چاہئیے-عشق بہت بڑا بادشاہ ہے-اگر اس سے التجا کی گئی تو وہ ضرور مان جائیگا-یہ یاد رکھو کہ بغیر اس سے صلح کئے گزیر نہیں-قامت کو یہ مشورہ بہت پسند آیا اور اسی وقت اپنا لاؤ لشکر چھوڑ عشق کی خدمت میں پہنچا-اس کی بہت مدح و ستایش کی-عشق نے بھی اس کی بہت تعظیم و تکریم کی اور عزت سے اپنے پاس بٹھایا-ہمت نے پہلے اِدھر ادھر کی باتیں کیں پھر موقع سے عقل اور دل کا ذکر چھیڑا اور ان کی طرف سے ایسی نیابت کی کہ عشق راضی ہوگیا اور یہ قرار پایا کہ دل عشق بادشاہ کی وزارت قبول کرے عشق کے بعد سب سے بڑا رتبہ اسی کا ہوگا-عشق بادشاہ اور دل وزیر ہوا تو کام خاطر خواہ چلے گا—

اس کے بعد عشق نے اپنے سر لشکر مہر کو حکم دیا کہ شہر بدن (تن) کو جائیے-عقل کو تسلی اور دلاسا دے اور عزت و حرمت سے یہاں لائیے-غرض مہر جس قدر جلد ہوسکا شہر بدن پہنچا اور عقل سے ملاقات کی-عشق نے جو کچھ کہا تھا حرف حرف بیان کیا اور سب اونچ نیچ سمجھائی اور کہا کہ کسی طرح کی فکر نہ کر-تیرے اقبال نے زور کیا ہے وہاں جانے کے بعد سب خرخشے دور ہوجائیں گے اور تو امن و آسائش اور بلند اقبالی کے ساتھہ رہے گا-عقل نے یہ سمجھہ کر کہ اب حکومت و دولت سب جاچکی ہے-یار-دوست-مشیر اور مصاحب سب نے منہ پھیر لیا ہے مصلحت یہی ہے کہ عشق کی بات مان لی جائے کیونکہ اب عشق سے صلح بغیر کوئی صورت نہیں-غرض اس نے عشق کا فرمانا قبول کیا اور مہر کے ساتھہ عشق کے حضور میں پہنچا-دست بوسی کی اور دعائیں دیں-عشق عقل سے مل کر بہت خوش ہوا اور اسے گلے لگایا اور ہر طرح خاطر جمع کی اور کہا کہ میں بادشاہ اور تو وزیر-ملک اور حکومت تیرے سپرد ہے-مجھہ سے ملک داری کی سردردی نہیں ہوسکتی جو تو مناسب سمجھے سو کر—

غرض جب عقل عشق بادشاہ کا وزیر مقرر ہوگیا تو عشق نے ہمت سے کہا کہ دل کو ہجران کے کوٹ سے نکال کر میرے سامنے حاضر کر-اور اس کے پاؤں کی بیڑی نکال کر رقیب کے پاؤں میں ڈال اور غیر کو جو اسکی بیٹی ہے ایسی جگہ قید کر کہ وہاں سے نکل نہ سکے-ہمت سلام کر کے روانہ ہوا-اور دل کو ہجران کے کوٹ سے لڑ جھگڑ کر باہر لایا-اس کی بیڑیاں رقیب کے پاؤں میں ڈالیں اور غیر کو بھی ایک مکان میں بند کر دیا-اگرچہ اس پر اس کا دل دکھا مگر حکم کی تعمیل واجب تھی-غیر نے جیسا کیا تھا ویسا پایا-اس کے بعد ہمت دل کو عشق کے پاس لایا اور عشق کو دل سے ملایا-سب ایک دوسرے کے گلے ملے-آخر عقل اور عشق نے باہم مشورہ کر کے یہ ٹھیرایا کہ حسن کا عشق سے عقد کردیا جائے-غرض بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی-اور دونوں

کی مراد برآئی-گھر گھر عیش وعشرت کا سماں تھا اور خوشی کے شادیانے بج رہے تھے—

ایک روز دل اور ھمت اور نظر تینوں شراب پئے رخسار کے گلزار میں آئے-
وھاں آب حیات کا چشمہ دیکھا-عاشقوں کو چشمہ بہت بھایا اور کہا کہ اگر یہ آب حیات پی لیا تو عاشق اگر ھزار بار مریگا تو ھزار بار جئے گا-ھمت نے کہاکہ اے دل اس پیر روشن ضمیر کی قدمبوسی کر-یہ حضرت خضرھیں-دل نے دوڑ کر خضر کے قدم لئے-ادب سے الگ بیٹھا-اور اس بزرگ کی دعالی-دل کے دل میں راز کا خیال آیا-خضر نے بھی آنکھہ سے وھی اشارہ کیا-دل اور آنکھوں سے باتیں ھوئیں مگر وہ بات انھیں دونوں میں رھی-خضر کے فیض سے دل اپنی مراد کو پہنچا-دل اور حسن رھے سھے-پھولے پھلے-بال بچوں والے ھوئے-ان کا سب سے بڑا فرزند یہ کتاب ھے جو اپنے وقت کا افلاطون و لقمان ھے-روشن ضمیر اور صاحب تدبیر ھے-سب اس کی صحبت سے خوش-ھر ایک اس کی باتوں سے شاد کام-جو کوئی صاحب نظر ھوگا اسے یہ سخن بھائے گا اور قدر کریگا—

سارا قصہ اتنا ھے جسے مینے کسی قدر تفصیل سے بیان کر دیا ھے-گو اس میں عام قصوں کی سی دلچسپی نہو مگر انسانی جذبات کی حقیقت اور کش مکش کو فسانے کی صورت میں مصنف نے جس طرح بیان کیا ھے اس میں ایک لطف ضرور پیدا ھوگیا ھے نام بھی حالات و واقعات کے لحاظ سے بہت موزوں رکھے ھیں-اگرچہ کہیں کہیں وہ بھولے سے تن کی جگہ بدن اور لٹ کی جگہ زلف-یعنے مترادف الفاظ لکھہ جاتے ھیں لیکن افسوس یہ ھے کہ جگہ جگہ پند و نصائح کا دفتر کھول دیا ھے جس سے قصے کی دلچسپی کم ھوجاتی ھے-اور بعض مقامات پر یہ پندو نصیحت بہت بے موقع معلوم ھوتی ھے-مثلاً پہلی دفعہ جب دل اور حسن کی ملاقات باغ میں ھوتی ھے اور وہ آپس میں راز و نیاز کی باتیں کرتے ھیں تو وھاں خدا کی وحدانیت اور تصوف و فقر کا بیان بالکل بے موقع ھے-یا وصل کی شب عشق کا فلسفہ اور عشق کی قسموں پر بحث بے محل معلوم ھوتی ھے-اسی قسم کی بے موقع بحثوں اور مواعظ سے پڑھنے والے کی طبیعت کو الجھن پیدا ھوتی ھے اور قصے کا لطف جاتا رھتا ھے-اس میں شک نہیں کہ مصنف نے جس خیال پر اس قصے کی بنیاد رکھی ھے وہ بہت خوب ھے اور اس میں ایک قسم کی جدت پائی جاتی ھے-عقل اور عشق اور دل اور حسن کی لڑائی عالم گیر ھے-اور جیسا کہ مصنف نے ظاھر کیا ھے عشق ھمیشہ جیتتا اور عقل ھمیشہ ھارتی ھے-حسن غالب اور دل مغلوب رھتا ھے-اگرچہ ان مین ھمیشہ جنگ رھتی ھے لیکن در حقیقت یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں-بلکہ یہ جدو جہد ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کی ھے اور یہ وہ کشش ھے جو سارے عالم پر چھائی ھوئی ھے-اور اسی کی برکت ھے کہ انسان کی زندگی میں ایسی دلکشی پیدا ھوگئی ھے کہ اسے

جان اس قدر عزیز ہے اور اس دکھیا بستی کو چھوڑنا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ دراصل مصنف کا مقصد اس کتاب سے نصیحت کرنا ہے جسے اس نے قصے کے پیرائے میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن قصے اور نصیحت کے ملا دینے سے نہ قصہ قصہ رہتا ہے۔ اور نہ نصیحت نصیحت۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ اسے اس طرح بیان کرتا کہ پڑھ کر دل پر چوٹ لگتی۔ خیال مزہ لیتا۔ دماغ اثر پزیر ہوتا۔ یہ نصیحت و وعظ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کھلی نصیحت بہت کم کارگر ہوتی ہے۔ قصے کا راز اسی میں پنہاں ہے——

مصنف نے یہ قصہ پرانے بادشاہوں کے قصوں کی طرح بیان کیا ہے۔ وہی دربار ہے وہی جنگ وجدل ہے اور ویسے ہی مصاحب اور مشیر ہیں۔ وہی کوہ قاف کی پری اور جادو کا اثر ہے۔ لیکن بڑی خوبی یہ ہے کہ فضول اور بے سر و پا باتیں اس میں مطلق نہیں۔ غیر مہذب اور فحش باتوں سے حتی الامکان احتراز کیا ہے۔ نصیحت و وعظ سے تو وہ کہیں نہیں چوکتا۔ لیکن ایسی صاف اور پاکیزہ زبان میں ادا کرتا ہے کہ کتاب کا مقبول ہونا یقینی ہے اور اس میں شک نہیں کہ مصنف کے زمانے میں یہ کتاب ضرور مقبول ہوئی ہوگی اور لوگ اسے پند و موعظت کی کتاب سمجھ کر پڑھتے ہونگے اور اس تصنیف سے یہی اس کا اصل مقصد تھا۔ طرز بیان بھی اس کا بہت سادہ ہے۔ اگرچہ مقفیٰ ہے اور اس میں تکلف کرنا پڑتا ہے مگر عام لوگ اسے نئی چیز سمجھ کر ضرور شوق سے پڑھتے ہونگے۔ نثر میں قافیہ کا التزام اگرچہ بھونڈی بات ہے اور خلاف عادت ہے لیکن اس میں ایک دلکشی بھی ہے۔ نظم کا بھی کہیں کہیں چٹخارا ہے اور بعض مقامات پر اپنی طبعزاد نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو نظم و نثر دونوں پر قدرت ہے۔ خود وجہی کو بھی اپنی اس تصنیف پر ناز ہے اور کہتا ہے کہ اس فصاحت اور لطافت سے کسی نے آج تک ایسی کتاب نہیں لکھی۔ یہ میری ایجاد ہے اور جو اس رستے پر چلے گا وہ میرا مقلد ہوگا۔ مثلاً کہتا ہے " فرہاد ہو کر دو جہاں سے آزاد ہو کر۔ دانش کے تیشے سوں پھتراں الٹایا تو یو شیریں پایا۔ تو یو نوی بات پیدا ہوئی تو اس بات آیا............ دانا ہنا رہنہا کر جانیگا۔ هادي ہے کر پہچانیگا............ جیتے گنگار کرتے گن اس باغ میں تھے لینگے پھل چن۔ جس کے دماغ میں اس پھول کی باس جاویگی تازي ارواح تن میں آویگی۔ جو کوئی اول اچا یا بنیاد۔ اول آخر رہی استاد............ یہاں خدا بھی بولنہار اچہ ہے۔ جو کوئی ہماری بات چلیا وو ہمار اچہ ہے۔ ہر چند فہمداری ہے چلیا تو کیا ہوا بات ہماري ہے" اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں یہ کتاب عجیب اور بے نظیر ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے——

اب میں اس کتاب کے بعض مقامات بطور نمونے کے پیش کرتا ہوں جس سے اس

کی عبارت کا ڈھنگ اور اس وقت کی زبان کی کیفیت معلوم ہوگی—

کتاب حمد سے اس طرح شروع کی گئی ہے:—

"تمام مصحف کا معنی الحمداللہ میں ہے مستقیم-ہوا تمام الحمداللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم-ہوا تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھیا ہے کریم-سمجھہ دیکھہ خاطر لیا اتال-حدیث بھی یوں ہے کہ العلم نقطة و کثرها جهال- یعنے علم ایک نقطه ہے جاہلاں اسے بڈھاے-جہالت کو اس حد لگن لگائے-ہور فارسی کے دانشمنداں-جنوں سمجتے ہیں باتاں کے بنداں-انوکوں یوں بھایا ہے-انو میں بھی یوں آیا ہے کہ اگر در خانہ کس است-یک حرف بس است-ہور گوالیر کے چاتراں گن کے گراں-اینوں بھی باتکوں کھولے ہیں-یوں بولے ہیں (فرد) پوتی تھی سو کھوتی بھئی پنڈت بھیا نکوے-ایک ہی اچھر پیم کا پڑھے سو پنڈت ہوے-قدرت کا دھنی سہی-جو کرتا سو سب وہی-خدا بڑا خدا کی صفت کرے کوئی کتیک-وحدہٗ لا شریک-ماں نہ باپ-اپیں آپ-پروردگار-سینسار کا سرجنہار-جتی جکوی قدرت دھرتا ہے-صفت اس کی اپنے پرتے کرتا ہے-وو بیحد اس کی صفت کوں کاں حد- احد صمد لم یلد ولم یولد (بیت) کسے ہے حد جو خدا کی صفت کی حد پاوے-ہر ایک بال کوں گر سو ہزار جیب آوے-جس کا ناؤں خدا ہے-وو سب سوں ملیا ہور سب سوں جدا ہے-کوئی کیوں اسے کہے کہ یوں ہے-خدا ہے جوں کہیں کہ تیوں ہے-کوں سمج سکتا خدا کی گت-ایک اپے لا کہ صفت-ہزاروں اور ایک اس کا ناؤں-اس کی معرفت تہاویں تہاؤں (بیت) جہاں جکچھ ہے وہاں سب اہے ظہور اس کا-ہر ایک شے منے دیتا ہے جلوہ نور اس کا-خدا قادر-خدا حاضر-خدا ناظر خدا سکتا-جے جیوں منگتا اسے ووں رکھتا-سات زمین سات آسمان میں اس کا کھیل-جو کچھہ وہ کرے سو ہوے اس حکم کوں کون سکے تہیل-اپیں آپ جل جلال-دم مارنے یہاں کسے نیں مجال-(بیت) اس تہار پر کسے ہے نظر جو نظر سٹے-گر جبرئیل ہوئے تو بھی یہاں بال و پر سٹے"—

نعت و منقبت:—

"عشق خدا کوں بھیدیا تو اس کی خاطر آسمان زمیں ہویدا کیا-عشق خدا کوں بھیدیا تو اپنا جیب کر محمد کوں پیدا کیا-اگر محمد نا ہوتا تو آسمان زمیں نا ہوتا-اگر محمد نا ہوتا تو ماہ و پرویں نا ہوتا-اگر محمد نا ہوتا تو دنیا ہور دین نا ہوتا-صاحب طٰه و یٰسٓ-صاحب الا رحمة للعالمین-جس کے نور تے عالم نے پایا روشنی-لولاک لما خلقت الافلاک کا دھنی-اول خدا ہے نبی دویم سویم ہے ولی-یو تین ناؤ تھے مومن کے دل کوں تجلی-محمد کو جس رات ہوئی معراج-وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج-گیان دھیان کے کام تمام محمد نے لیا یا جو کچھہ پانا تھا سو

محمد نے پایا۔جو کچھہ محمد نے پایا سو علی کوں سمجایا۔یو سمج علی کی تقسیم آیا۔ علی خدا کوں بھایا۔رسول کوں بھایا۔محمد نبی۔علی ولی۔نبوت خدا کی پیشوائی۔ ولایت محبوبی ہور استغنائی۔نبوت کارسازی۔ولایت بے نیازی۔ولایت ھار گلے یار کا۔نبوت دھندا گھردار کا۔ولایت آکر نبوت آتی۔نبوت آئی تو کیا ولایت جاتی۔ فرق دھندے کا تک میانے آتا۔کسے کچھہ سپڑتا کوئی کچھہ پاتا۔حضرت کہیں خدا شاھد۔ انا و علی من نور واحد۔تن سوں تن جیو سوں جیو دم سوں دم۔نبوت محمد پر ولایت علی پر ختم۔ابابکر عمر ہور عثمان۔جنوں کی نیکی جانتا سب جہاں۔حضرت کے یاراں ہیں بزرگواراں ہیں۔اکستی ایک سب بھلے۔جوں خدا رسول فرمایا تیوں چلے۔ لاف نہیں کئے۔خلاف نہیں کئے۔حق پر چلنھارے ایسیچہ اچھتے ہیں۔خدا کے پیارے ایسیچہ اچھتے ہیں۔حضرت کے یار جنو سوں کرتے تھے بچار۔آخر بعد از حضرت کے بیٹھے حضرت کی ٹھار (بیت) ہر ایک حال خدا کوں یقین سوں جپنا۔ولایت ہور نبوت یو قرب ہے اپنا۔ولایت کی جاگا پر نبوت کی جا صدر۔ایکستی ایک خوب ایکستی ایک خوبتر۔خدا بہوت بڑا۔سب ٹھار حاضر سب ٹھار کھڑا۔سب میں اپنا نور بھریا۔کسی کچھہ کسی کچھہ کسی سب کچھہ کریا''

سبب تالیف کتاب و مدح بادشاہ:—

''سلطان عبداللہ۔ظل اللہ۔عالم پناہ۔صاحب سپاہ۔حقیقت آگاہ۔دشمن پرور۔ ثانی سکندر۔عاشق صاحب نظر۔دل کے خطرے تے باخبر۔صورت میں یوسف تے اگلے۔ آدم بیہوش ہو پتھر پگلے۔حکمت میں افلاطوں شاگرد۔سخاوت میں کھولے حاتم کا برد۔شجاعت میں رستم گرد۔عالی ھمت غازی مرد۔شمشیر ہور ھمت کے صاحب۔ نیم دھرم اور ست کے صاحب۔دارا در۔فریدوں فر۔کلیم بیان۔مسیحا دم۔مریخ صولت۔زھرہ عشرت خورشید علم۔صبا* کے وقت۔بیٹھے تخت۔یکایک غیب تے رمز پاکر دل میں اپنے کچھہ لیا کر۔وجہی نادر منکوں۔دریا دل گوھر سخنکوں۔حضور بلائے۔ پان دئے۔بہت مان دئے ہور فرمائے کہ انسان کے وجود بچہ میں کچھہ عشق کا بیان کرنا۔اپنا نائوں عیاں کرنا۔کچھہ نشان دھرنا۔وجہی بھوگنی گن بھریا۔تسلیم کر کر سر پر ھات دھریا۔بہوت بڑا کام اندیشیا۔بہت بڑی فکر کریا۔بلند ھمتی کے بادل تے دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا۔قدرت کے اسراراں برسایا۔بادشاہ فرمائے پر چنتیا۔نزی تقطیع بیتیا کہ آنگے کے آنھارے۔ھمیں بھی کچھہ تھے کر سمجیں بارے۔ ھمارے گن کوئی دیکھے سوھنا دیکھے۔گنگا دیکھے سو جمنا دیکھے۔ھمنا تے بھی آنگے تھے سو انو کا کچھہ تمیز کریں۔ریاضت مشقت ھماری چیز کریں۔عاشق کو عاشق جانتا۔

---

*صباح

عاشق کو عاشق پہچانتا (بیت) کند هم جنس باهم جنس پرواز-کبوتر با کبوتر باز با باز-
مورک آسودے دیوانے-نیں جلے بات* کیا جانے-جیوں تیوں اس دنیا میں کچھه
یاد گار اچھے تو خوب هے-یو جهاز هے اس جهاز کوں بار اچھے تو خوب هے-اس دنیا میں
رهیگی سو بات هے-باقی وو دیس کا یو سو رات هے-جنے کچھه سمجا سمجیا عاقبت
لگن-انے اپنی جاگا رکھیا اپنا گن-استے نہیں رها گیا-کچھه کها گیا-که شاید کدهیں
کوئی عاشق پڑھے تک تلملے تک چر پھرے-تک مستی چھرے تک تر پھرے-هور سمجے
که ان عاشق کامل نے کیا بولیا هے-کس کس جاگا پر کیسے کیسے بھیداں کھولیا هے-هم
گلاب ابلوج گھولیا هے-هم مانک موتی رولیا هے-داد دیوے-مراد دیوے-کسے کچھه
سنپڑے کسے کچھه انپڑے .... ''—

در زینت سخن و تسمیۀ کتاب :—

'' یو قدرت الله هے-یو اسرار الله هے-یو هاتف الله هے-لااله الاالله-یه عجب
کتاب هےسبحان الله-اس کتاب کا ناؤں سب رس-سبکوں پڑنے آوے هوس-بول بول
کوں چڑھے امس-یاد گار هو اچھے گا دنیاں میں کئی لاک برس-بهوتیچهه شیریں
بهو تیچهه لذیذ-عاشقان کے گلے کا تعویذ-یو کتاب سب کتاباں کا سرتاج-سب
باتاں کا راج-هر بات میں سو سو معراج-اس کا سواد سمجے نا کوئی عاشق
باج-اس کتاب کا لذت پانے عالم سب محتاج-کیاعورت کیا مرد-جس مین کچھه عشق کا
درد-اس کتاب کو سینے پرتے هلاسی نا-اس کتاب بغیر اپنا وقت بهلاسی نا-جو کوئی
پڑیگا-جنس جنس کا اثر چھریگا-جو کوئی اِس کتاب کا سمجے گا معنا-کیا حاجت هے
اسے کیف کھانا-یو کتاب عاشقان کا جیو صاحب-معشوقان کا یار مصاحب-یو رنگ رنگ
پھول سرنگ مقبول-سب کسی بھاتے-یو پھول دایم تازے هرگز نہیں کھلاتے-ایسے
خوش باس کے پھولاں اجھوں کسی باغ نیں کھلے-ایسے پھولاں اجھون کسی نین ملے-
سنگتے دل میں بھرے اساس-کہاں هے وہ پھول جس پھول میں ایسی باس-جو کوئی
یو کلام سنے گا پڑیگا-هور فاتحه نا پڑیگا-تو وو بے خبر خام هے-اس کی دانش پر
اس باب کا لذت حرام هے-کیا واسطه که یو بات نہیں یو تمام وحی هے الهام هے-جسے
خدا کی محبت سوں غرض هے-اس پر فاتحه همارا فرض هے-اگر ممات هے تو ادهر
کی سعادتی کا-واگر حیات هے تو ادهر کی سلامتی کا-اگر کسی میں سخن شناسی
هور اسرار دانی هے-تو یه کتاب گنجالعرش بحرالمعانی هے-جیتا کوئی طبعیت کے
کواڑ کھولیگا-اس کتاب میں نہیں سو بات کیا بولیگا-جو کچھه اسمان هور زمین
میں هے-سو اس کتاب میں هے-جو کچھه دنیا هور دین میں هے-سو اس کتاب میں

---

* بات

ہے-ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت کوں اس نہایت سوں نہیں کیا-اس دہات بات کوں سلاست نہیں دیا-ہر ایک بشر کا کام نہیں-ہر ایک بیخبر کا کام نہیں-اس کتاب کو وو سمجیگا جو کوئی صاحب راز ہے-یو کتاب تمام اعجاز ہے-اگر دین ہور دنیا کا امید پانے منگتا ہے تو یو کتاب دیکھہ-اگر بڑا ہو کر عالم کو سمجانے منگتا ہے تو یو کتاب دیکھہ-مسلمانان میں پیر و مرشد ہویگا-ہندواں میں جنگم سد ہویگا-ہم ہندو تجتے بات پاتجے مانیگے-ہم مسلمان تجے بڑا ہیکر جانیگے-ایک کلمے کا فرق ہے- باقی خدا کی وحدانیت میں ہندو مسلمان غرق ہے.......... خدا حق ہے ہور حق سب تھار ہے-آدمی کی جنس کو حق پراتے کیا بار ہے—

جیتے چوساراں جیتے فہمداراں-جیتے گن کاراں-ہوے سن-آج لگن-کوئی اس جہان میں-ہندوستان میں-ہندی زبان سوں-اس لطافت اس چھنداں سوں-نظم ہور نثر ملاکر گلاکر یوں نہیں بولیا-اس بات کوں اس نبات کوں یوں کوئی آب حیات میں نہیں گھولیا-یوں غیب کا غلم نہیں کھولیا-خضر کے مقام کو انپڑنا-تو اس بات میں پڑنا-میں تو یو بات نہیں کیا ہوں-عیسیؑ ہوکر بات کوں جیودیا ہوں-دانش کے باغ میں آیا-بہار ہوکر پھولاں کھلایا-اگر کوئی ہوڑ کوڑ جہالت سوں-بد اصالت سوں رزالت سوں-بات کرے نا-سمجھ یو مایا-یو خدا بھی اس جاگا حضرت جیسے کوں کہیا ہے کہ کوڑاں-میں مجہول نامعقول-مردود نا مقبول سن یا رسول..........

غرض بہت نادر نادر باتاں بولیا ہوں-دریا ہوکر موتیاں رولیاں ہوں-موتیاں کی موجاں کا میں دریا ہوں-تمام موتیاں سوں بھریا ہوں-اس دریا میں غوطے کھانے کے تو جاگا جاگا کے غواصاں موتیاں پانے کے-یو کتاب عجائب ایک بندر ہے-اگر سورج منگتا وگر چندر ہے-فرہاد ہوکر دو جہاں تھے آزاد ہوکر دانش کے تیشے سوں پتھراں (پہاڑاں) التایا تو یہ شیریں پایا-تو یو نوی بات پیدا ہوی تو اس بات آیا-نادان ایتی باتاں میں یو بی ایک بات کر جانے-وے یو بات کیوں کاڑی کس وزاں* سوں نکلی محنت نہیں سمجے مشقت نہیں پہچانے-انو کوں نہیں کتے زباں آور-یو بولتے جناور.......... کام بہوت خاص کیا ہوں-چلتی عمارت راست کیاہوں-یو غیب کی بشارت-جسے عمارت کتے سو یو عمارت-ماٹی پہتر کی عمارت سدا رہتی نہیں-رہ بیوفا کچھ اس میں وفاداری نہیں-دنیا دو دیس کا-کوں کسکا- آخر رہیگا سو یو چہ قدر جاننا اس کا-مال دھن سب خرچا جاویگا-آخر یو چہ کام آویگا-آخر نام یوچہ اچاویگا-یو خدا کی عنایت-یاں کیا شکایت-خدا بہوت بڑا بے نہایت"—

---

* وضع

قصے کا آغاز یوں ہوتا ہے —

" آغاز داستان - زبان ہندوستان - نقل - ایک شہر تھا - اس شہر کا ناؤں سیستان - اس سیستان کے بادشاہ کا ناؤں عقل - دین و دنیا کا کام استے چلتا - اس کے حکم باج ذرا کیں نہیں ہلتا - اس فرمائے جنو چلے - ہر دو جہاں میں ہوے بھلے - دنیا میں خوب گنوائی - چار لوکاں میں عزت پائی - جاں رہے کھڑے - واں قبول پڑے - نہ آفت دیکھی نہ زلزلا - اپے بھلے - تو عالم بھلا - کسے کون برا بولنا یو وسواس ہے - بھلائی برائی سب اپنے پاس ہے - اپے چل نہیں جانتے - دسریاں پر برا مانتے - اول اپنی خبر میں اپے رہنا - پچھے دسرے کوں برا کہنا - جنے اپس کوں پچھانیا - انے سب جانیا - جدھر ڈھلنا ہے - اودھر عقل کے اجالے میں چلنا ہے - آدمی نے عقل چھوڑیا - دیوانہ ہوا اپنا سر اپے پھوڑیا - عقل میں جو کا کلوت ملتی - تو حرمت میں نقصان ہوتا - مدعا دور پڑتا دلتی - منگتا ہے جو دل کو تازا رکھے مدعا پاوے - تو بھلا ہے جو عقل میں کاکلوت نا ملاوے - سکت ہے تو عقل میں ہمت کوں کر شریک - یو پند ہے اگر تجھہ میں کچہ سمجھہ ہے تو سیک - جو کوئی یو چلنت چلتا ہے وو کامل ہوتا ہے - روشن طبیعت زندہ دل ہوتا ہے - عقل میں کاکلوت جوں ریشم میں سوت جوں دود میں چھاچھہ - جوں پاچ میں کاچہ .... "

خاتمۂ کتاب

" ہزار شکر کہ بارے الحمداللہ کتاب تمام ہوا - مقصود حاصل ہوئے سب کام ہوا زور سوں نہیں آتا فام - سمج سوں آلگتا کام - اتال جوں حسن ہور دل اپنی مراد کوں انپڑے - اپنی کمال اعتقاد کو انپڑے - تیوں بادشاہ ہور بادشاہ کے دوستاں - بادشاہ کے عزیزاں - بادشاہ کے خویشاں قرابتاں - بادشاہ کی پیاریاں پیارے - مانتے منگنہارے بادشاہ کے خدمتگاراں - دولت خواہاں - دعا گویاں - امیدواراں - سب اپنی مراد کو انپڑو انو کوں غیب کی نعمت سنپڑو - رزق فراخ اچھو - ہمیشہ بعیش و عشرت اچھو - دایم بدولت اچھو - عاقبت بخیر اچھو - ایمان سلامت اچھو - آمین یا رب العالمین "

اب رہی کتاب کی زبان - سو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس کی حالت بہت کچھہ اوپر کے نمونے سے ظاہر ہے - طرز بیان اگرچہ سادہ اور صاف ہے لیکن زبان قدیم ہے بہت ایسے الفاظ اور محاورے ایسے آتے ہیں جو اس وقت بالکل سمجھہ میں نہیں آتے اور جن کی تحقیق میں بہت کچھہ کاوش کرنی پڑی - زبان کے صرف و نحو میں بھی اس وقت کی زبان سے بہت فرق ہے - میں اس کے متعلق کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ضمن میں بہت کچھہ لکھہ چکا ہوں - بالکل وہی باتیں اس میں بھی پائی جاتی ہیں - مثلاً

۱-اکثر عربی الفاظ کے املا کو سادہ کر دیا ہے یعنے جس طرح بولے جاتے ہیں ویسے ہی لکھ دئیے ہیں جیسے نفع کو نفا یا وضع کو وضا یا وزا یا وزاں-واقعہ و واقا-منع کو منا-طمع کو طما-معاملہ کو ماملہ-معنے کو مانا-چنانچہ طمع کا قافیہ جما یا جیا لکھا ہے-مثلاً و و عبث جیا جس کے دل میں یو نہیں طما—

۲-مؤنث میں فعل کی جمع جیسے ''اصیل عورتاں اپنے مرد بغیر دسرے مرد کوں اپنا حسن دیکھلانا گناہ کر جانتیاں ہیں-اپنے مرد کوں ہر دو جہاں میں اپنا دیں و ایماں کر پچھانتیاں ہیں''

۳-اسی طرح اضافت کی بھی جمع آتی ہے-مثلاً اسکیاں انکھیاں لالی-دل کے فائدے کیاں بہت باتاں ہیں—

۴-اسی طرح جتنی-ایسی-جیسی کی جمع جتنیاں-ایسیاں-جیسیاں وغیرہ—

۵-کر کا استعمال-جیسے دانا ہمنا رہنما کر جانے گا-اگر بولوں گا دشمن کر جانے گا

۶-سی مستقبل کے لئے-جیسے-بعض کہتے ہیں کہ خدا کوں اس نظر سوں دیکھیانا جاسی-نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر میں نا آسی—

۷-اردو میں اکثر الفاظ کا تکرار ہوتا ہے اور خاص معنے پیدا کرتا ہے-جیسے گھر گھر-در در-مگر قدیم دکنی اردو میں ان دو کے درمیان ے کا اضافہ کرتے تھے-مثلاً گھرے گھر-درے در-تہارے تہار-رگے رگ-وغیرہ—

۸-مانگنا بمعنی چاہنا-یہ استعمال اکثر انگریزوں کی زبانی سنا گیا ہے اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ انہیں کی ایجاد ہے-لیکن قدیم دکنی اردو میں یہ لفظ انہیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے-جیسے اگر منگتا ہے غمکوں مارے شراب ہے-اگر منگتا ہے جفا ترے آنگے ہارے شراب ہے-اگر منگتا ہے سخاوت پر آنے تو شراب پی-اگر منگتا ہے رن میں گھوڑے بہانے تو شراب پی-اگر منگتا ہے حسن کا نظارا کرنے تو شراب پی-اگر منگتا ہے دل میں محبت بھرے شراب پی-اگر کچھ اونچا چڑنے منگتا ہے تو شراب پی-اگر خدا کو انپڑنے منگتا ہےتو شراب پی—

۹-الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی کچھ زیادہ خیال نہیں کیا-مثلاً شراب-خبر-صورت-دنیا کو مذکر لکھا ہے—

غرض اسی قسم کی اور بھی کئی باتیں ہیں جو غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتی ہیں اور جنھیں ہم اس موقع پر تفصیل سے نہیں لکھ سکتے-یہ کتاب عنقریب انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کی جائے گی-شروع میں ایک مقدمہ اور آخر میں مفصل فرہنگ ہوگی-کتاب کی صحت بڑی احتیاط اور غور سے کی گئی ہے-قدیم زبان کا سمجھنا اور قلمی نسخوں کا پڑہ کر صحیح کرنا آسان کام نہیں ہے—

فردوسی کا مذہب

از

(جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے-پی-ایچ-ڈی
پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور)

(یہ مضمون امام المستشرقین پروفیسر نولڈکی کی اس کتاب سے ماخوذ ہے جو انہوں نے جرمن زبان میں رزمیات ایران پر تصنیف کی ہے-پروفیسر موصوف کی ذات محتاج تعریف نہیں-وہ ہنوز زندہ ہیں اور اس وقت ان کا سن نوے برس کے قریب ہے-لیکن ان کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ اب تک جاری ہے-کتاب مذکور انہوں نے اول بار سنہ ۱۸۹۶ ع میں لکھی تھی اور اب سنہ ۱۹۲۰ ع میں بار دوم اسے مزید تصحیح اور اضافات کے ساتھہ شایع کیا ہے-جناب ڈاکٹر صاحب پوری کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں جو انجمن ترقی اردو کے سلسلے میں شایع ہوگا—

فردوسی کے مذہب پر پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے بھی ایک مضمون لکھا ہے-یہ مضمون تین سال ہوئے جب لکھا تھا اور اب تک شایع نہیں ہوا-اس کی تحریر کے وقت انہیں پروفیسر نولڈکی کے مضمون کی مطلق اطلاع نہ تھی-فاضل پروفیسر نے ازرہ کرم وہ مضمون ہمیں عنایت فرمایا ہے جو جنوری کے نمبر میں شایع ہوگا-اڈیٹر)

فردوسی کے مذہبی رجحان کی تحقیق کرنا خاص دلچسپی کا موجب ہے* لیکن یہ ذرا زحمت طلب کام ہے کیونکہ شہادات کسی قدر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں-اول تو یہ مطلق ضروری نہیں کہ ایک مشرقی شاعر مذہبی سر زمین کے اندر

* سر زمین مشرق میں مذہب کو اہمیت حاصل ہے-اس کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھہ بحث کی جائے—

(جس میں شدید اندرونی اختلافات کا دور دورہ ھے) عقائد کے تغیر سے ھمیشہ محفوظ رھا ھو ھم دیکھتے ھیں کہ بزرگان دین بھی جو امور مذھبی میں غور و خوض کرنے کے عادی ھوتے ھیں سدا اپنے اعتقادات پر مستقل نہیں رھتے-اس پر ایک مزید دقت یہہ ھے کہ شاھنامے کے وہ منفرد اشعار جن میں مذھبی عقیدے کا اظہار پایا جاتا ھے بعد والوں کے اضافہ کئے ھوئے معلوم ھوتے ھیں*-یا بعض اشعار ایسے ھیں کہ وہ ھیں تو فردوسی کے لکھے ھوئے لیکن ان میں خفیف سا تغیر کرکے مطلب کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ھے-پھر ایک اور بات قابل توجہ یہ ھے کہ اس زمانے کے سیاسی اور معاشرتی حالات فردوسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنے مذھبی عقائد کو تمام و کمال اور بے ریائی کے ساتھہ بیان کرسکتا-اس کو اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنے خوش عقیدہ ناظرین کے سامنے اپنے تئیں خوش عقیدہ ظاھر کرے-غرض یہ کہ ان دقتوں پر نظر رکھتے ھوئے ھم کو یہ توقع نہیں رکھنی چاھئے کہ ھم ایک بالکل صاف اور یقینی نتیجے پر پہونچ سکیں گے-

فردوسی اپنی قوم کی قدیم روایات کا تہ دل سے دلدادہ تھا-جو اشعار اس نے شاھان ایران اور وھاں کے قدیم سورماؤں کی شان میں لکھے ھیں ان کے ھر لفظ سے شاعر کی ارادت و محبت ٹپکتی ھے-ان سب کو وہ شروع سے آخر تک بزرگان خدا پرست بتاتا ھے اور جو شخص شاھنامے کو بغور پڑھے اس کے دل پر یہی نقش بیٹھتا ھے کہ فردوسی یہ فرض کئے ھوئے ھے کہ وہ سب کے سب خداے کریم کے جوار رحمت میں داخل ھو چکے ھیں-دقیقی زرتشتی کے حق میں وہ دعا کرتا ھے کہ خدا اس کے گناھوں کو بخشے اور قیامت کے دن اس پر اپنی رحمت کا سایہ کرے-

خدایا ببخشا گناہ ورا بیفزاے در حشر جاہ ورا

(شاھنامہ ص ۱۹ س ۳)-ایک پکا مسلمان شاید ایسی دعا نہ مانگ سکے-لیکن یہ کہنا بھی مشکل ھے کہ فردوسی صرف اسلام کے پردے میں ایک مجوسی تھا-دراصل اس کا طبعی میلان مذھب زرتشت کے ان عقائد کی طرف تھا-جو بلند معیار ھونے کے باوجود مطابق عقل بھی ھوں-اس قدیم مذھب کی ایسی باتوں کا جو نہ صرف اھل اسلام بلکہ روشن خیال اصحاب کے لئے قابل نفرت ھوں ذکر کرنے سے اس نے یا تو پہلو تہی کی ھے یا ان کی تاویل کرلی ھے-یا اگر اس نے خود نہ کی ھو تو اس سے پہلے خدائی نامے (جو شاھنامہ کا ماخذ ھے) کے مولفوں نے کی ھوگی-اگرچہ اس نے خود بھی قدیم ایرانیوں کو محاورہ زبان کے عام استعمال کے مطابق "آتش پرست" کہا ھے تاھم ساتھہ ھی آتش پرستی کے الزام کو بھی ان پر سے دور کیا ھے کہ آتش تو فقط سمت نماز کی

---

* دیکھو اس مضمون کے آخر میں—

تعیین کے لئے ہے ورنہ حقیقی پرستش تو دراصل خدائے واحد ہی کی مقصود ہے—

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

چنانچہ شاہنامہ (ص ۳۰۳ س ۱۴ و ۱۵) میں وہ کہتا ہے—

بیک هفته بر پیش یزداں بدند مپندار کاتش پرستاں بدند
که آتش بداں گاه محراب بود پرستنده را دیده پر آب بود

ایسے ہی ایک زرتشتی قیصر روم سے کہتا ہے کہ "برترین عناصر" (یعنی آگ) ہمارا قبلہ ہے—

همان قبله شان برترین گوهراست که از خاک و آب و هوا برتراست

(شاہنامہ ص ۵۶۹ الف س ۲۷) اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ فردوسی مذہب کا قائل تھا وہ پکا خدا پرست اور موحد ہے اور یہی اصولی عقیدہ وہ برابر اپنے ممدوح سورماؤں کی طرف بھی منسوب کرتا ہے حتیٰ کہ سکندر کی طرف جو اس کے نزدیک عیسائی ہے۔خدائے واحد۔خلاق جہاں۔عالم و قدیر کی جو عظمت اس کے دل میں ہے اس کا اظہار ہر موقع پر وہ ایسے طریقے سے کرتا ہے کہ وہ فقط ایمان راسخ ہی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔اس کے نزدیک انسان اس بات کو معلوم نہیں کر سکتا کہ خدا کی ذات و صفات کی نوعیت کیا ہے صرف اتنی بات پر ایمان رکھنا کافی ہے کہ خدا ہے—

به بینند گاں آفریننده را نه بینی مرنجان دو بیننده را
نیابد بدو نیز اندیشه راه که او برتر از نام واز جایگاه
سخن هرچه زیں گوهراں بگذرد نیابد بدو راه جان و خرد
خرد گر سخن بر گزیند همی همان را گزیند که بیند همی
ستودن نداند کس اورا چوهست میاں بندگی را ببایدت بست
خرد را و جان را همی سنجد او در اندیشهٔ سخته کے گنجد او
بدیں آلت و رای و جان و روان ستود آفریننده را چوں تواں
بهستیش باید که خستو شوی زگفتار بیکار یکسو شوی
پرستنده باشی و جوینده راه بفرماں نہا ژرف کردن نگاه
ازیں پرده برتر سخن گاه نیست بهستیش اندیشه را راه نیست

(شاہنامہ ص ۱۷)

ترا کردگاریست پروردگار توئی بندهٔ کردهٔ کردگار
چو گردن باندیشه زیر آوری زهستی مکن پرسش و داوری
نشاید خور و خواب و باا و نشست که خستو نباشد بیزداں که هست
دلش کور باشد سرش بی خرد خرو مندش از مردماں نشمرد
زهستی نشانست بر آب و خاک زدانش مکن خویشتن در مغاک

توانا و دانا و دارندہ اوست خرد را و جاں را نگارندہ اوست

(شاھنامہ ص ۱۶۲-۱۶۳) زرتشتی مذھب میں ثنویت کے عقیدے کی وہ تردید کرتا ھے-اس کے نزدیک خدا ھی نیک و بد اور ھست و نیست کا خالق ھے—

خداوند ھست و خداوند نیست ھمہ بندگانیم و ایزد یکیست

(شاھنامہ ص ۵۲ س ۱۶)

ازو یست نیک و بد و ھست نیک ھمہ بندگانیم و ایزد یکیست

(ص ۵۷ س ۲) آغاز شاھنامہ میں حمد کے جو اشعار ھیں ان سے مطلق خدا پرستی کا عقیدہ ظاھر ھوتا ھے نہ مخصوص طور سے اسلامی عقیدہ-اپنے بیٹے کے مرثیے میں بھی جہاں اس کا دل اپنے صادق ترین جذبات کا اظہار کر رھا ھے اس نے کوئی بات ایسی ظاھر نہیں کی جو اس کے حقیقی اسلامی رجحان پر دلالت کرتی ھو-جہاں اس نے سکندر کی زیارت کعبہ کا حال لکھا ھے (جس کا مأخذ اسلامی روایات ھیں) وھاں کہا ھے کہ خدائے دو جہاں کے لئے حیز و مکان غیر ضروري ھے—

خداي جہاں را نیاید نیاز بجای خور و کام و آرام و ناز

(شاھنامہ ص ۳۹۶ س ۲۷) اس میں صاف طور سے اس نے "بیت اللہ" کے اسلامی مفہوم میں ایک اختلافی عقیدے کا اظہار کیا ھے*-عرب کے اس مقدس مقام (یعنی کعبے) کا ذکر اس نے بالکل ویسے ھی معمولی طور سے کیا ھے جیسا کہ مجوسیوں کے مقامات مقدسہ کا جہاں وہ آگ کے سامنے خدائے حقیقی کی پرستش کرتے ھیں+-ایک جگہ وہ کہتا ھے کہ قدما کے لئے آگ ٹھیک اسی طرح سمت نماز کی تعیین کرتی ھے

---

* اسی کے ساتھ ھی ایک اور شعر اسؔ عقیدے کی تردید میں موجود ھے—

خداوند خواندیش بیت الحرام بدو شد ترا راہ یزداں تمام

(شاہنامہ ص ۳۹۶ س ۲۶) لیکن لیڈن کے قلمی نسخے میں یہ شعر نہیں ھے اور کوئی شک نہیں کہ کسی نے بعد میں اضافہ کیاھے—

+ لیکن شاعر کے یہ الفاظ کہ—

گرت ھست جامی مئے زرد خواہ بدل خرمی را مداں از گناہ

(ص ۳۹۴ س ۲۷) کوئی خاص طور سے اسلامی تعلیم کی مخالفت میں نہیں کہے گئے بلکہ محض خوش طبعی کا اظہار ھے جیسا کہ اکثر مشرقی شعراء کے کلام میں ھوتا ھے-لیڈن کے نسخے میں اس خلاف شرع شعر کو ترک کردیا گیا ھے اور شتراس برگ کے دو نوں نسخوں میں اس سے اگلے شعر کو بھی ساتھ ھی حذف کیا گیا ھے جو یہ ھے—

نشاط و طرب جوی و مستی مکن گزافہ میندار مغز سخن

لیکن ان میں سے ایک نسخے میں ان دو شعروں کی بجائے ایک اور شعر لکھدیا گیا ھے جس میں قافیہ یہی ھے—

جیسے که اهل عرب کے لئے پتھر—

بداں گه بدی آتش خوبرنگ　　چو مرتازیاں راست محراب سنگ

(شاهنامه طبع فولرس ص ۱۸ س ۱۷) اس سے بھی فردوسی کے دل میں اسلام کی کوئی خاص عظمت ظاهر نهیں هوتی-اس پر یه اعتراض بے شک هوسکتا هے که "پتھر" سے مراد زمانۂ جاهلیت کے بت بھی لئے جاسکتے هیں لیکن هم کو اس میں شبه نهیں که شاعر کے ذهن میں اس شعر کو لکھتے وقت حجر اسود کا خیال تھا جس کی طرف اهل اسلام عندالصلوۃ اپنا رخ کرتے هیں—

نئے مذهب (اسلام) کے مبلغین یعنی اهل عرب سے فردوسی کو یقیناً نفرت هے وه کهتا هے که یه لوگ اپنے ذاتی فائدے کی خاطر اپنے آقا سے دغا کرتے هیں—

نباشند یاور ترا تازیاں　　چو جائی نیابند سود و زیاں

بدرد دل اندر بآزار نیز　　بدشمن سپارندت از بهر چیز

(شاهنامه ص ۵۶۱ س ۲۱) وه بھوکے اور قلاش لوگ هیں—

بدیں تخت شاهی نهادست روی　　شکم گرسنه مرد دیهیم جوی

(ص ۶۱۰ س ۱۷) یزدگرد عرب فاتحین کے متعلق طوس کے مزربانوں کو لکھتا هے که "یه مار خور دیو صورت لوگ جو دانائی اور شرم سے بے بهره هیں اور جن کے پاس نه دولت هے نه شهرت نه اقبالمندی نه شرافت تمام دنیا کا ستیا ناس کیا چاهتے هیں"—

ازیں مار خور اهرمن چهرگان　　ز دانائی و شرم بی بهرگان

نه گنج و نه نام و نه تخت و نژاد　　همیداد خواهند گیتی بباد

(ص ۶۱۰ س ۱۶) ایسے هی اگلے شعر میں ان کی سیاه رنگت کی وجه سے ان کو "زاغ ساران"* کها هے اور یهی لقب ایک وطن پرست ایرانی عربوں کے سپه‌سالار سعد بن ابی وقاص کے لئے استعمال کرتا هے—

---

* اس لفظ سے هم کو عهد شجاعت میں ایرانیوں کے افسانوی دشمنوں کی یاد آتی هے جن کو "سگ ساراں" اور "گرگ ساراں" کها گیا هے اهل شام نے بھی اپنے زمانے کے عربوں کو به تفاوت یسیر "غراوے" (بمعنی کوا در زبان‌سریانی) کها هے-دیکھو تامس مرگاوی (Thomas of Marga) طبع بج (Budge) ص ۳۱۶ س ۱۵ مصنف-تامس نویں صدی عیسوی میں عراق میں کسی خانقاه کا راهب تھا اسکی جس کتاب کا یهاں حواله دیا گیا هے وه اس خانقاه کے رهبان و مجاورین کی تاریخ هے جو اس نے سریانی زبان میں لکھی تھی اور جس کو بج صاحب نے مع انگریزی ترجمے کے چھپوایا هے-مترجم

بدست یکی زاغ سرگشته شد بما بر چنیں روز برگشته شد

(ص ۶۱۱ س ۹) اسی مقام پر اگلے شعر میں ایرانی سپہ سالار رستم کے حق میں جزائے خیر کی دعا کی ھے اور اس کے مقابلے میں سعد کو موت کی بد دعا دی ھے—

که یزدان وراجائے نیکان دهاد سیه زاغ را زخم پیکان دهاد

گذشته صفحات میں جس پیشینگوئی کا ذکر کیا جا چکا ھے اس میں فردوسی نے عہد اسلام کو ایران کے قومی بادشاھوں کے لئے سخت بد بختی کا موجب بتلایا ھے اور اسی خیال کو اس نے یزدگرد کے خط میں بھی نظم کیا ھے—

شود خوار ھرکس که بود ارجمند فرومایه از بخت گردد بلند

پراگندہ گردد بدی در جہان گزند آشکارا و خوبی نہان

بہر کشوری در ستمکارۂ پدید آمد و زشت پتیارۂ

نشان شب تیرہ آمد پدید زما بخت فرخ بخواھد برید

(شاھنامه ص ۶۱۰) اسی کے ساتھہ سپہ سالار رستم کے خط کا حسرت آمیز لہجہ بھی قابل غور ھے جسمیں اس نے قومی سلطنت کی تباھی پر خیالات کا اظہار کیا ھے (شاھنامه ص ۶۰۶) لیکن یہہ سب ایسے انداز میں لکھا گیا ھے که اسکے محض لفظی ترجمے سے شاعر کا اسلام سے تنفر واضح نہیں ھوتا اور عربوں کے خلاف نفرت کا اظہار تو اکثر ایرانی مصنفین کے ھاں پایا جاتا ھے حتیٰ که ان لوگوں کے ھاں بھی جو پکے مسلمان ھوئے ھیں اگرچه خوش عقیدگی کے نقطۂ نظر سے یہہ بات ھمیشه مذموم خیال کی جاتی ھے—

شاھنامه (صفحه ۳۹۲) میں فردوسی نے چار مذھبوں کا ذکر کیا ھے که نوع انسان اس کے نزدیک انھی چاروں میں منقسم ھے یعنی (۱) ایرانی (مجوسی)- (۲) یہودی-(۳) یونانی (عیسائی)-(۴) عربی (اسلام) اور اس موقع پر بھی اس نے اسلام کی افضلیت کو دو چار لفظوں میں بیان کر کے ٹال دیا ھے-

یکی دین دھقان آتش پرست که بی باژ برسم نگیرد بدست

دگر دین موسی که خوانی جہود که گوید جز ایں دیں نشاید ستود

دگر دین یونانی آن پارسا که داد آورد در دل پادشا

چہارم زتازی یکی دین پاک سر ھوشمندان بر آرد ز خاک

ھم دیکھتے ھیں که مذھبی مناقشات سے فردوسی کو بالکل دلچسپی نہیں ھے- بندوی ایرانی اور ینانوس رومی کے مابین ارکان مذھب کے بارے میں جو مناظرہ اس نے نظم کیا ھے (شاھنامه صفحه ۵۷۳) اس سے صاف اس خیال کی تائید ھوتی ھے- ایک اور مقام پر وہ کہتا ھے که بادشاہ کے لئے مذھب ضروری چیز ھے لیکن رعایا کے اندر مختلف مذاھب کا پایا جانا کوئی مذموم امر نہیں- محض باتوں سے دنیا اجڑ نہیں

سکتی-انسان کو چاھئیے کہ اپنے دلی عقائد کا علانیہ اظہار کرے—

جهاندار بی دین جهان‌را ندید   اگر هر کسی دین دیگر گزید
یکی بت پرست و دگر پاک دین   یکی گفت نفرین به از آفرین
زگفتار ویراں نگردد جهان   بگوي آنچه رایت بود در نهان
چو بی‌دیں بود پادشا همچنیں   نیابد بگیتی ز کس آفریں
بود دین و شاهی چوتن بارواں   بدین هردوان پایدارد جهاں

(شاهنامه ص ۵۲۴ س ۲۲-۲۳)-هندوستان کے بت پرست راجه اور ایران کے یزدان پرست بادشاہ کے درمیان عہد دوستی و وفاداری کو وہ همدردی اور استحسان کی نظر سے دیکھتا ھے—

دو شاه بت آرای و یزدان پرست   وفارا بسودند با دست دست
کزاینپس دل از راستی نشکنیم   همه بیخ کژی زبن بر کنیم
وفادار باشیم تا جاودان   سخن بشنویم از اب بخردان

الخ (شاهنامه ص ۴۷۰)-اوپر هم اس بات کی طرف اشارہ کر آئے هیں کہ سکندر اعظم کی شخصیت میں فردوسی نے عیسائیت کا ذکر تعریف کے ساتھه کیا ھے (دیکھو صفحه ۳۲)-لیکن اسی کے ساتھه یہه بات بھی قابل توجه ھے کہ عیسائی رهبان جو بد نصیب یزدگرد کو آداب و احترام کے ساتھه دفن کرتے هیں اسکو مرحوم و مغفور اور جنت الفردوس میں مقیم خیال کر رهے هیں (شاهنامه ص ۶۱۳)-دراصل وہ شاعر کے اپنے خیالات کی ترجمانی ھے جس کے نزدیک ایک دیندار عیسائی اور دیندار مجوسی کافر نہیں ھے-غرض یہه کہ هم کو فردوسی کی طبیعت میں کہیں مذهبی جنون یا تعصب کا شائبه نظر نہیں آتا—

بعض مقامات بیشک ایسے بھی هیں جن میں عیسائیت کے خلاف متعصبانه رائے کا اظہار کیا گیا ھے لیکن وہ کوئی اسلامی نقطۂ نظر سے نہیں لکھے گئے بلکه عیسائیوں کے ساتھه پارسیوں کے مذهبی مناظروں کا پرتو ھے جن کو فردوسی نے زمانۂ متاخر (یعنی ساسانی زمانے) کے پارسی مآخذ میں دیکھا ھے اور اس میں کسی قدر ایران اور عیسائی روم کے سیاسی مناقشات کا بھی اثر ھے-مثلاً یہه قول کہ—

مسیح فریبندہ خود کشته شد   چو از دین یزداں سرش گشته شد

(شاهنامه ص ۴۹۳ س ۳۱) اسلامی عقیدے کی روسے بالکل قابل رد ھے-ایک اور مقام پر ایک پارسی قیصر روم کو ملامت کرتا ھے کہ عیسائی لوگ اپنے نبی کے اس فرمان کی پیروا نہیں کرتے کہ اگر تمہارے ایک گال پر کوئی تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اسکے سامنے کردو (متی باب ۵ آیت ۳۹-لوقا باب ۶ آیت ۲۹)-اور بجائے تقوي اور پرهیز گاري کے جو عیسیؑ کی سنت ھے عیاشی میں زندگی بسر کرتے هیں اور

ایک معمولی شخص کو جس کو یہودیوں نے پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا خدا کا بیٹا بنا کر اسکی پرستش کرتے ھیں—

نه بینی که عیسی مریم چه گفت — بدانگه که بگشاد راز از نهفت
که پیراهنت گر ستاند کسی — میاویز با او به تندی بسی
وگر برزند کف برخسار تو — شود تیره از زخم دیدار تو
میاور تو خشم و مکن روی زرد — بخوابان تو چشم و مگو هیچ سرد
بکمتر خورش بس کن از خوردنی — مجوی از بنا شدت گستردنی
شما را هوا بر خرد شاه گشت — دل از آز بسیار بیراه گشت
بهر جای بیداد لشکر کشید — از آسودگی تیغها بر کشید
همه چشمه گردد بیابان ز خون — مسیحا نبود اندرین رهنمون
یکی بینوا مرد درویش بود — که نانش ز رنج تن خویش بود
چو آورد مرد جهودش بهشت — چو بی یار و بیچاره دیدش بکشت
همان کشته را نیز بردار کرد — بدان دار دین ورا خوار کرد
تو گوئی که فرزند یزدان بد او — بدان دار برگشته خندان بد او

(شاهنامه ص ۵۶۹ الف) اس مقام میں بھی یہ بات که حضرت عیسیٰ کو واقع میں مصلوب کیا گیا قرآن کی تعلیم کے خلاف ھے۔آگے چل کر دو جگه عیسیٰ کی الوھیت کے خلاف مناظرہ کیا ھے ص ۵۸۷ و ۵۹۹ اور چونکه اس مسئلے میں مسلمان اور مجوسی عیسائیوں کے خلاف متفق ھیں لہذا فردوسی نے نہایت یکسوئی اور اطمینان کے ساتھه اس کی تائید کی ھے لیکن مجوسی علماء کے مذھبی تعصب کے خلاف شاہ ھرمز نے جو یه فیصله کیا ھے که یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھه رواداری کا سلوک واجب ھے* اس پر فردوسی نے اپنی راے کا کچھه اضافه نہیں کیا—

دگر گفت کاے شہریار بلند — که ھرگز بجانت مبادا گزند
جہودان و ترسا ترا دشمن اند — دو رویند و باکیش اهریمنند
چنین داد پاسخ که شاه سترگ — ابی زینهاری نباشد بزرگ

(شاھنامه ص ۵۲۴) یہودیوں کے متعلق اس نے متعدد جگه حقارت آمیز راے کا اظہار کیا ھے اور ھندو مذھب کی بھی اس نے ایک جگه غیر ھمدردانه تشریح کی ھے (دیکھو شاھنامه ص ۵۶۹ الف)

دوسرے مذاھب کے متعلق فردوسی کے فتووں کا انحصار زمانۂ متأخر کے مآخذ پر ھے لیکن اس قدر یقینی ھے که اس کی بجائے اگر کوئی راسخ الایمان مسلم

---

* دیکھو طبری-جلد ۱ ص ۹۹۰-۹۹۱—

ہوتا تو اپنے خیالات کا اظہار بالکل مختلف طریقے سے کرتا۔ بااین ہمہ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں فردوسی صاف ایک مسلم کے بھیس میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ ان میں یقیناً بعض اشعار (خصوصاً نیڈن والے نسخے میں) جن میں محمد اور ان کے صحابہ پر ہزار ہزار درود و سلام بھیجے گئے ہیں* اپنی جگہ پر بے محل معلوم ہوتے ہیں اور بلا شبہ بعد کی ایجاد ہیں۔اسی طرح رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق کسریٰ انوشیرواں کے خواب پر جو فصل ہے (شاہنامہ ص ۵۳۱ وہ پوری کی پوری الحاقی ہے چنانچہ وہ مول کی اڈیشن میں اور نیز ان تین قلمی نسخوں میں جو اس وقت میرے پیش نظر ہیں موجود نہیں ہے۔محمود کی شان میں ایک جگہ ایک شعر ہے—

زمنبر چو محمود گوید خطیب بدین محمد گراید صلیب

(شاہنامہ ص ۵۲۴ س ۳۰) لیکن اس میں کسی اسلامی سرگرمی کا اظہار نہیں ہے بلکہ دراصل صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ محمود غازی اسلام ہے†۔رستم کے نام سعد وقاص کے خط میں فردوسی نے تمام اسلامی عقائد کو مختصراً نظم کیا ہے (شاہنامہ ص ۶۰۷) لیکن اخیر میں اپنی رائے کا اضافہ کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا برخلاف اس کے دیباچہ میں ایک پوری فصل ”ستائش پیغمبر و یارانش“ کے لئے وقف کی گئی ہے (ص ۱۸ جس میں شاعر نے محمد کی نبوت کا اقرار کیا ہے۔اس فصل کے اصلی ہونے میں مجال شک نہیں اور لہذا اسی کی مطابقت میں بعض اور اشعار بھی مثلاً—

درودی فرستی به پیغمبرش که صلوات تاج است بر منبرش

(ص ۴۲۷ س ۱۲) جو میرے ہاں سب نسخوں میں موجود ہے اصلی ہو سکتے ہیں اور طبعاً یوسف و زلیخا کے دیباچے میں اس قسم کے اشعار اور بھی زیادہ ہیں۔لیکن ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اگر فردوسی اس طرح سے مذہب کا اقرار نہ کرتا تو اس پر سختی سے ارتداد کا الزام لگایا جاتا اور بلا تأمل سزائے موت کا مستوجب ہوتا۔محمد کے مرسل من اللہ ہونے پر فردوسی کا ایمان صحیح اسلامی عقائد کے معیار پر تو مشکل سے پورا اترے گا سچ پوچھئے تو ہم تو اتنا بھی تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ کی نبوت پر وہ کسی طرح سے بھی مطمئن تھا۔البتہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کی

---

* مثلاً یہ شعر اکثر آیا ہے—

ہزاراں درود و ہزاراں سلام ز ما بر محمد علیه السلام

† یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر اصلی ہے اگرچہ میرے قلمی نسخوں میں موجود نہیں ہے جن میں اس مقام پر مضمون بالکل دگرگوں ہے—

عظمت کا احساس اس کے دل میں ضرور تھا۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں جو دیباچۂ شاہنامہ (ص ۱۸) میں ہیں اور جن کا متن نظامی عروضی کے ہاں (چہار مقالہ ص ۴۹) بھی بعینہ وہی ہے جو آج شاہنامے میں پایا جاتا ہے لیکن ہجو کے اندر مختلف ہے —

حکیم این جہاں را چو دریا نہاد | بر انگیختہ موج ازو تند باد
چو ہفتاد کشتی برو ساختہ | ہمہ بادبانہا برافراختہ
یکی پہن کشتی بسان عروس | بیاراستہ ہمچو چشم خروس
محمد بدو اندروں با علی | ہماں اہلبیت نبی و وصی
اگر خلد خواہی بدیگر سرای | بنزد نبی و وصی گیر جای
گرت زین بد آید گناہ منست | چنین است آئین و راہ منست
برین زادم و ہم برین بگذرم | چناں داں کہ خاک پئی حیدرم

چونکہ سلطان محمود کے عہد حکومت میں مذہب تشیع سخت بدگمانی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لہذا اس زمانے میں اس قسم کے خیالات کا اظہار صورت حالات کو دیکھتے ہوئے غیر محتمل معلوم ہوتا ہے لیکن ان اشعار کی اصلیت اٹل ہے کیونکہ سلجوقیوں کے عہد میں بھی جو کٹر سنی ہوتے ہیں محمود سے کم نہ تھے اس قسم کے شیعی عقائد کو بیچ میں اضافہ کرنے کا کوئی خاص باعث نہیں ہو سکتا تھا*۔ ہجو کے اندر فردوسی نے خود بھی بار بار جتلایا ہے کہ میں اپنے ملحدانہ (یعنی شیعیانہ) عقائد کے اظہار کی وجہ سے سلطان کی نظر میں کھٹک رہا ہوں اور اسی کے ساتھ وہ روایت بھی متفق ہے کہ فردوسی کے ساتھ محمود کی ناخوشنودی کی وجہ اس کا میلان تشیع تھا۔ البتہ جب اس نے یوسف زلیخا تصنیف کی تو اس کے پاس کافی وجہ موجود تھی کہ اپنے کو علانیہ شیعی کہے کیونکہ آل بویہ اگرچہ سنی خلیفہ کے معاون و محافظ تھے تاہم خود مذہباً شیعی تھے†۔ پھر اس کے علاوہ فردوسی کا آبائی وطن (طوس) اس سرے سے اس سرے تک شیعی تھا۔ جس زمانے میں خلیفہ ہارون الرشید اپنے آخری ایام وہاں بسر کر رہا تھا تو "شانی امیرالمومنین" (یعنی حضرت علی سے بغض رکھنے والا) کے لقب سے مشہور تھا‡ اور یہ بات خود

---

* مصنف کا اشارہ یہاں نظامی عروضی کے متن کی طرف ہے کیونکہ وہ سلجوقیوں کا معاصر تھا ۱۲ مترجم —

† لیکن زلیخا کے اندر جو اشعار اہل سنت کے لئے دل آزاری کا باعث ہوسکتے تھے ان کو بعض نسخوں میں بدل کر سنی عقائد کے مطابق کردیا گیا ہے —

‡ دیکھو کتاب الاخبار الطوال للدینوری صفحہ ۳۸۸ —

اس ذی اقتدار شہنشاہ سے جو اس وقت مرض الموت میں گرفتار تھا پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس میں شک نہیں کہ ہارون الرشید نے آل علی کی ایذا رسانی میں کچھہ کمی بھی نہیں کی تھی—

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو قدامت ایران کا اس قدر سرگرم مداح ہے۔اهل عرب کا علانیہ دشمن ہے۔غیر مذهب کا پاس کرتا ہے اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ خود پرجوش مسلم نہیں ہے کیونکر ممکن ہے کہ وہ داماد رسول عربی کا اس درجہ گہرا احترام اپنے دل میں رکھتا ہو جو شیعیان علی کے ایک فرقے میں یہاں تک بڑھا کہ آخر کو وہ علی کی الوهیت کے قائل ہوگئے؟ یہاں ہمارے سامنے ایک ایسی صورت واقعہ درپیش ہے جو مذهبی سر زمین میں اکثر ظہور پذیر ہوا کرتی ہے اور ایران میں جو سربرآوردہ لوگ گزرے ہیں ان میں سے اکثر کی حالت میں هم یہی بات دیکھتے ہیں۔فردوسی کا معاصر البیرونی جو شاعر تو نہیں ہے لیکن ایک باریک بیں فاضل محقق ہے اس کی بھی بعینہ یہی حالت ہے کہ اس کو اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔عربوں سے اس کو نفرت ہے لیکن اس پر بھی تشیع کی طرف مائل ہے۔اگرچہ شیعہ مذهب صدیوں بعد جاکر ایران کا قومی مذهب قرار پایا تاہم اس کا بیج بہت پہلے سے پھوٹنا شروع ہو گیا تھا*—

ہمارے نزدیک یہ امر قابل تصور نہیں ہے کہ فردوسی نے دیباچے میں ذیل کے اشعار لکھے ہونگے جن میں صحیح سنی تعلیم کے مطابق ابوبکر کو صحابہ میں سب سے مقدم کہا گیا ہے۔پھر عمر۔پھر عثمان اور چوتھی جگہ پر علی+—

که خورشید بعداز رسولاں مه نتابید برکس ز بوبکر به
عمر کرد اسلام را آشکار بیارا ست گیتی چو باغ بہار
پس از ہردو آں بود عثماں گزیں خداوند شرم و خداوند دیں
چہارم علی بود که جفت بتول که اورا بخوبی ستاید رسول

یہاں بخوبی یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس موقع پر سلطان کے اپنے عقیدے کی لازمی رعایت سے یہ شعر بیچ میں بڑھا دئے گئے ہیں۔فردوسی کا دلی عقیدہ تو اس امر سے کھلتا ہے کہ اس نے علی کا ذکر خیر کس قدر طوالت اور بسط کے ساتھہ کیا ہے اور جو اشعار اوپر لکھے گئے ہیں ان سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی بد مذاق سنی نے

---

* لیکن سعدی با ایں همه سنی تھا—

+ پطرزبورغ کے نسخے میں ان اشعار کو کچھہ تو حذف کرکے اور کچھہ بدل کر شیعہ عقیدے کے مطابق کرلیا گیا ہے اور یہ کسی نے محض اپنی سمجھہ اور مرضی سے کیا ہے نہ متن کی قدیم روایت کی بنا پر—

ان کو بے محل بیچ میں ٹھونس دیا ھے کیونکہ ان سے تسلسل بیان میں سرتاپا خلل واقع ھو گیا ھے۔ان کے مقابل کا شعر یعنی—

چہ گفت آں خداوند تنزیل ووحی خداوند امر و خداوند نہی

ظاھر کرتا ھے کہ یہاں رسول اللہ کے کسی قول کی تمہید اٹھائی گئی ھے۔وہ قول دراصل ان چار شعروں کے مابعد کے شعر میں بیان کیا گیا ھے جوایک صحیح شیعی حدیث کے مطابق ھے یعنی—

کہ من شہر علمم علیم درست درست ایں سخن قول پیغمبرست

اس شعر کا اعادہ ھجو کے اندر بھی کیا گیا ھے۔اب خیال کرنا چاھئے کہ ایک طرف تو خالص شیعی روایت بیان کی جارھی ھے اور بیچ کے چار شعروں میں خالص سنی عقیدے کا اظہار کہاں تک موزوں اور بر محل سمجھا جاسکتا ھے! داستان سکندر کی تمہید میں بھی فردوسی نے اپنے شیعی عقائد کی تائید کی ھے چنانچہ کہتا ھے کہ" معشر صحابہ کے سرگروہ علی ھیں جن کو پیغمبر نے علی ولی کے لقب سے پکارا ھے۔صحابہ سب کے سب معصوم اور خدا ترس ھیں لیکن علی کے اقوال* اعداد و شمار سے باھر ھیں" †—

سر انجمن بد زیاراں علی کہ شیعیش خواند علی ولی
ھمہ پاک بودند و پرھیزگار سخن‌ھائے او برگذشت از شمار

برخلاف اس کے عمر کو امیر عرب کہا ھے جس کی تلوار سے دن رات ھو جاتا تھا—

چنان بد کجا سرفراز عرب کہ از تیغ او روز گشتی چو شب

(شاھنامہ ص۶۰۱) لیکن یہ یقیناً وطن پرستی کے نقطۂ نظر سے کہا گیا ھے نہ شیعی عقیدے کی وجہ سے۔اس سے اگلا شعر جس میں عمر کی ستائش کی گئی ھے بلا شبہ الحاقی ھے‡—

عمر آں کہ بد مومنانرا امیر ستودہ ورا خالق بی نظیر

لیکن صحابہ کی تعریف خواہ کتنی ھی مختصر طور سے کیوں نہ کی گئی ھو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ھے کہ فردوسی گو شیعہ تھا لیکن غلاۃ میں سے نہ تھا اور اگر ایسا

---

* لیڈن کے نسخے میں "سخنھائے" کی بجائے "صفتھائے" کا لفظ ھے جو زیادہ مناسب ھے—

† فولرس کی اڈیشن میں شاھنامے کا وہ حصہ جس میں یہ اشعار ھیں طبع تو ھوا تھا لیکن شائع نہیں کیا گیا۔میکن کے ھاں یہ ساری فصل مفقود ھے حالانکہ وہ یقیناً اصلی ھے—

‡ مول نے اپنی اڈیشن میں اس کو اور ماقبل کے شعر کو ناحق حذف کردیاھے لیکن لیڈن اور شٹراس برگ کے نسخوں میں دونو موجود ھیں—

ہوتا تو اس کی نوعیت مزاج کے لئے موزوں بھی نہ تھا*—

یہ امر قرین قیاس ہے کہ ہمارا شاعر جو نہ تو اپنے خیالات میں مستقل تھا اور نہ ابوالعلا المعری کی طرح اٹل فولادی طبیعت رکھتا تھا بھرور زمان اسلام کی طرف جو رائج الوقت مذہب تھا زیادہ مائل ہوتا گیا ہوگا اس میں شک نہیں کہ اس نے اکثر جگہ لطف شراب کی تعریف کی ہے لیکن پھر ساتھہ ہی بعض جگہ اپنے کو تنبیہ بھی کی ہے کہ اس عیاشی کا کفارہ دے اور دوسری دنیا کو چلنے کی تیاری کرے—

غرض یہ کہ ہم مکرر اس امر کو ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ فردوسی اپنی زندگی میں یقیناً کبھی کسی ٹکسالی یا رائج الوقت مذہب کا پرجوش رکن نہیں رہا+—

یہ یقین کرنا ذرا مشکل ہے کہ مکتب کے علوم درسی جو فردوسی کے زمانے میں متداول تھے (مثلاً دینیات اور علم الکلام وغیرہ) اس نے توجہ کے ساتھہ حاصل کئے ہوں گے لیکن ان علوم کے ساتھہ اس کو اتنی واقفیت ضرور تھی جتنی کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی کو ہونی چاہئے-چنانچہ وہ اپنی نظم میں وقتاً فوقتاً اس واقفیت کا اظہار بھی کرتا ہے (دیکھو آرٹکل ۴۵)-ایک بات خصوصیت کے ساتھہ قابل توجہ ہے کہ ہمارا شاعر جس کی کتاب خوارق عادات-طلسمات اور دیو اور جادو اور بھوت پریت کے افسانوں سے پر ہے متعدد جگہ عقلیات کی طرف میلا ن کا اظہار کرتا ہے-"خرد" یا "عقل" کے معانی کو اس نے نہایت شد و مد کے ساتھہ بیان کیا ہے-شاہنامے کے پہلے ہی شعر میں "خرد" کو بہت بڑا عطیۂ الٰہی بتلایا ہے—

بنام خداوند جان و خرد   کزین برتر اندیشہ بر نگذرد

اور اس کی دوسری فصل "ستائش خرد" کے لئے مخصوص کی گئی ہے—

---

* ناصر خسرو نے بھی اپنی ایک نظم میں جہاں وہ اپنے شیعی ہونے کا اعتراف کرتا ہے (دیوان طبع تبریز ص ۳۸) "عدل فاروقی" کا ذکر خیر کیا ہے البتہ جب وہ اسماعیلی ہوکر غلاۃ میں جا ملا تب اسلے عمر کے محبوں کو قیامت کے دن خدا کی کرسی عدالت کے سامنے ملامتی ٹھہرایا ہے (دیوان ص ۲۴۱)—

+ شاہنامے کی مذہبی بے تعصبی کا مقابلہ جب ہم ان اسلامی اور عیسائی تصانیف کے ساتھہ کرتے ہیں جن میں اختلاف عقائد کی بنا پر تاریک و تیرہ تعصب سے اظہار نفرت کیا گیا ہے تو ہمیں بے انتہا مسرت حاصل ہوتی ہے—

موسیقی

از

(جناب محمد حسین صاحب عرشی امرتسری)

آغوش کن میں تھا جہاں تھی بند چشم عرشیاں
سونا تھا صحن آسماں تھا ایک خموشی کا سماں
اک دھیمی دھیمی روشنی آگے دبے پاؤں بڑھی
گویا یہ پہلی صبح تھی چشم جہاں جس سے کھلی
تاروں نے آنکھیں کھول دیں روشن قبائیں اوڑہ لیں
افلاک پر خوشیاں ہوئیں فردوس میں دھومیں مچیں
برگ و شجر نو خیز تھے طائر ترنم ریز تھے
نغمے سرورانگیز تھے گویا شراب آمیز تھے
کیا ہی سہانا تھا سماں کیا ہی لطافت تھی عیاں
ناگاہ ابر درفشاں اوپر اٹھا مثل دخاں
گرنے لگی چھم چھم پھوار بہہ نکلے رود و آبشار
پھر لہلہائے سبزہ زار اور جوش میں آئے ہزار
اس وقت ازل کا باغباں مجلس فروز کن فکاں
پروردگار لامکاں تھا محو ابداع جہاں
یا بندۂ نایاب تھا خلاق خاک و آب تھا
کچھ فاتح ابواب تھا کچھ جامع اسباب تھا

ق-۱ نیران کوہ طور سے خورشید و مہ کے نور سے
روی صبیح حور سے خلد ضیا معمور سے
۲ انوار کو حاصل کیا- پھر لحن حوران سہا
اور طائران خوشنوا سے نغمۂ شیریں لیا
کچھہ ابر کی دلچسپیاں کچھہ باغ کی نیرنگیاں
کچھہ حسن کی بے مہریاں کچھہ عشق کی بیتابیاں
رنگ ید بیضا لیا — صدق دم عیسیٰ لیا
خال رخ لیلیٰ لیا — حسن ضو سلمیٰ لیا
قمري سے کو کو لی گئی- رفتار آهو لی گئی
عنبر سے خوشبو لی گئی — عشاق کی خو لی گئی
خالق نے سب یکجا کیا نام اس مرکب حسن کا
"موسیقی آواز" تھا — انساں کو یہ تحفہ دیا
کچھہ بانسری میں بھر دیا کچھہ چنگ میں پنہاں کیا
مضراب کو کچھہ مل گیا کچھہ تار بربط کو ملا
جادو طرازان جہاں ذوق مقالش گفتہ اند
محفل فروزان خرد سحر حلالش گفتہ اند *

*

اردو زبان کے متعلق ضروری اعداد

از

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب - رکن دارالترجمہ - عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)

سنہ ۱۹۲۱ ع میں اہل ہند کی جو مردم شماری ہوئی تھی اس کے اعداد اور نتائج تحقیقات دو جلدوں میں شائع ہوگئے ہیں - ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مردم شماری میں جہاں لوگوں کا مذہب سن و سال وغیرہ بہت سی باتیں دریافت کی جاتی ہیں وہیں ایک خانہ زبان کا بھی ہوتا ہے جس میں ہر شخص کی مادری زبان کا اندراج کیا جاتا ہے - تاکہ معلوم ہوجائے کہ ملک میں کس قدر افراد کیا کیا اور کتنی زبانیں بولتے ہیں - رپورٹ مردم شماری کے باب نہم میں اس تحقیقات کا نتیجہ اجمالاً پیش کیا گیا ہے اور ہمارے مضمون کو اسی باب کا تبصرہ سمجھنا چاہئے -

پچھلی دو مردم شماریاں ڈاکٹر (سرجورج) گریرسن کے دور میں ہوئیں جو علم السنہ کے ماہر اور ہندوستان کے محکمۂ "تحقیقات لسانی" کے ناظم بھی رہ چکے ہیں - زبانوں کی عامی تحقیقات میں ان کا جوش اور سرگرمی لائق داد ہے لیکن اس جوش کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلی دونوں مردم شماریوں میں بڑی بڑی زبانوں کی بجائے شمار کنندوں نے چھوٹی چھوٹی بولیوں کی تحقیقات شروع کردی جو آپس میں نہایت جزوی اختلاف رکھتی تھیں اور ہرگز اس قابل نہ تھیں کہ انہیں مردم شماری کی رپورٹ میں ایک مستقل زبان کی حیثیت سے نمایاں کیا جاتا - دوسری اسی باریک بینی نے شمالی ہند میں اردو ہندی کے مناقشے کو بالواسطہ تقویت پہنچائی - زبان کا خانہ ہندو مسلمانوں کی کشمکش کا دنگل بن گیا پنجاب و ممالک متحدہ کے بعض شمار کنندوں نے یہاں بھی اپنی لایعنی تعصبات کا اظہار کیا اور زبان کے متعلق جو اعداد چھپے وہ بہت مبہم اور مشتبہ ہوگئے - انہی

دنوں (گذشته رپورٹ پر) جو تبصرہ راقم الحروف نے رسالہ الناظر لکھنؤ میں کیا تھا اس میں بھی عہدہداران مردم‌شماری کی اس فتنہ‌زا تقسیم لسانی پر سخت نکتہ‌چینی کی تھی۔ لیکن اس قسم کی تنقید کا تو حکام پر کچھ اثر ہوا یا نہ ہوا۔ غالباً اتنا تجربے سے انھیں ضرور معلوم ہوگیا کہ زبان کی ایسی باریک و پیچیدہ تقسیم سے مردم‌شماری کا اصلی مقصد فوت ہوجاتا ہے اور اب جب کہ ڈاکٹر گریرسن کی تحقیقات لسانی (لنگوئسٹک سروے) کے نتائج بھی علیحدہ کئی جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں مردم‌شماری میں مشہور و مروج زبانوں کی تفریق و تفریع کرنا مفت کی زحمت و دردسری ہوگا اور گو اس رپورٹ سنہ ۱۹۲۱ ع میں بھی ممالک ہند کی کل زبانوں کی تعداد ۲۲۲ دکھائی گئی ہے۔ تاہم غنیمت ہے کہ متمدن علاقوں کی بڑی بڑی اور عام زبانوں کی اس شد و مد سے تقسیم نہیں کی گئی جیسی کہ پہلی مردم شماریوں کے وقت کی گئی تھی۔

ہندوستان کی بڑی زبانوں میں سب سے زیادہ اہمیت اردو یا ہندوستانی کو حاصل ہے اور اس مضمون میں اسی کے اعداد پر بحث کرنی منظور ہے۔ ڈاکٹر گریرسن کی انوکھی تحقیقات نے تو ہندوستان خاص کی اصلی زبان مغربی ہندی قرار دی تھی اور ہندوستانی اور اردو کو اسی نئی زبان کی دو علیحدہ علیحدہ شاخیں بنادیا تھا۔ پھر ان شاخوں میں اور بہت سے شاخسانے نکالے تھے۔ مردم شماری کے حکام نے ان کانٹوں میں الجھنا پسند نہیں کیا پھر بھی فاضل موصوف کی موشگافی کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ پچھلی مردم شماری تک صرف صوبۂ متحدہ کی چار مختلف زبانیں تسلیم کرلی گئیں (۱) مغربی ہندی (۲) مشرقی ہندی (۳) بہاری اور (۴) وسطی پہاڑی اور اسی تقسیم کے مطابق اعداد تیار کئے—— یا کہنا چاہئے کہ خراب کئے—— گئے۔ اعداد کی تیاری میں دوسرا فساد اردو-ہندی کے جھگڑے سے پیدا ہوا۔ حالانکہ اب مردم شماری کے لائق حکام کو اعتراف ہے کہ کوشش و کاوش کے باوجود زبان کے اعتبار سے ان دونوں میں وہ کوئی مابہ‌الامتیاز قایم نہیں کرسکے*! بہ الفاظ دیگر یہ سارا فساد فقط "انگور" و "عنب" کے اختلاف پر مبنی تھا۔

بہر حال صاف معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ مردم شماری اپنی یا ڈاکٹر گریرسن کی پیدا کی ہوئی الجھنوں سے خود بھی اس قدر پریشان ہوگیا تھا کہ اس دفعہ صوبۂ متحدہ کے ذی ہوش مہتمم مردم شماری مسٹر ایڈی نے یہ قاعدہ بنادیا کہ

* ملاحظہ ہو رپورٹ مردم شماری صفحہ ۱۹۵۔

ان لوگوں کی زبان جو صوبے کی مروجہ بولی بولتے ھیں-خانہ زبان میں صرف ہندوستانی کے نام سے درج کی جائے اور صاحب موصوف کو اعتراف ھے کہ اس سیدھے سادے مگر واضح قاعدے سے نہ کوئی مناقشہ پیدا ھوا نہ غلط فہمی اور جو اعداد حاصل ھوئے وہ بالکل قابل اعتماد ھیں—

مسٹر ایڈی کی اس لائق ستائش اصلاح کے باوجود دوسرے صوبوں میں مردم شماری والے ہندوستانی کو گریرسن صاحب کی اصطلاح یعنی مغربی ہندی ھی کے نام سے یاد کئے جاتے ھیں اور زیر تبصرہ رپورٹ میں بھی ھر جگہ یہی نام استعمال ھوا ھے حالانکہ انصاف سے دیکھئے تو ہندوستانی سے بھی بڑھکر اردو ایسا جامع اور موزوں نام ھے جس سے ذھن فوراً ھماری نئی اور مخلوط زبان کی نوعیت کی طرف منتقل ھو جاتا ھے جس کی مشترکیت میں کسی قوم کی تخصیص ھے نہ ملک و مذھب کی—

بہر کیف دوسری بڑی زبانوں کے مقابل اس " مغربی ہندی " کے بولنے والوں کا شمار رپورٹ میں ذیل کے نقشے (صفحہ ۱۹۵) سے دکھایا گیا ھے—

زبان	تعداد اھل زبان	ان کی فیصدی تعداد کل آبادی میں
(۱) مغربی ہندی-اردو	۹ کرور ۹۷ لاکھ	۳۰ ۶ ۵
(۲) بنگلہ	۴ کرور ۹۲ لاکھ	۱۵ ۶ ۵
(۳) تلنگی	۲ کرور ۳۶ لاکھ	۷ ۶ ۵
(۴) مرھٹی	۱ کرور ۸۸ لاکھ (تقریباً)	۶
(۵) تامل	۱ کرور ۸۸ لاکھ (تقریباً)	۶
(۶) پنجابی	۱ کرور ۶۲ لاکھ	۵
(۷) راجستانی یا مارواڑی	۱ کرور ۲۷ لاکھ	۴
(۸) کنڑی	۱ کرور ۳ لاکھ	۳ ۶ ۵
(۹) اڑیا	۱ کرور ۱ لاکھ	۳ ۶ ۲۵
(۱۰) گجراتی	۹۵ لاکھ ۵۰ ھزار	۳
(۱۱) ملایالم	... ۷۵ لاکھ (تقریباً)	۲ ۶ ۵
(۱۲) لہندا یا مغربی پنجابی	۵۶ لاکھ ۵۰ ھزار	۲
مابقی السنۂ خورد	۳ کرور ۵۰ لاکھ (تقریباً)	۱۰ ۶ ۵

رپورت کے نقشے میں سنہ ۱۹۱۱ ع کے اعداد اور اہل زبان کی تعداد میں کمی بیشی بھی دکھائی ہے اور اس کی رو سے اردو بولنے والوں کی تعداد میں ایک فیصدی کا اضافہ ہوا-لیکن یہ اعداد کچھہ زیادہ معتبر نہیں نظر آتے-مثلاً ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دس سال میں لہندا بولنے والوں میں اکھتا اتھارہ فیصدی کا اور اہل ملایالم میں دس فیصدی کا اضافہ ہوگیا یا راجستانی والوں کی تعداد بقدر دس فیصدی گھت گئی اور اس خلاف قیاس کمی بیشی سے ہی ظاہر ہے کہ یا تو پچھلے اعداد صحیح نہ تھے یا اس مرتبہ اعداد جمع کرنے میں کوئی نیا تغیر ہوا جس کی وجہ سے پہلے نتائج کا مقابلہ کرنا بے سود سا ہوگیا ہے —

اصل یہ ہے کہ اول تو ہندوستان نہایت وسیع ملک یا مجموعۂ ممالک ہے اور یہاں کی آبادی میں مختلف اور متبائن عناصر شامل ہیں-لوگوں کی عام جہالت اور کم فہمی سے شمار کنندوں کو جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں-دوسرے شمار کنندے بعض اوقات ذاتی تعصبات اور اپنی قومی مصلحتوں کی بنا پر یا محض تساہل و نا اہلی سے صحیح اعداد نہیں درج کرتے-مردم شماری عرصۂ دراز کے بعد ہوتی ہے اور اس کا عملہ ہنگامی طور پر جمع کر کے چند ماہ میں سارا کام ختم اور کام کرنے والوں کو (اکثر بلا معاوضہ) رخصت کر دیا جاتا ہے اور ان باتوں کے علاوہ شاید سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ مردم شماری کے نقشے میں رفتہ رفتہ اتنے خانے بڑھا دئے گئے ہیں کہ سب کی خانہ پری میں پوری صحت سے کام لینا مشکل ہو گیا ہے-شمار کنندے عام طور پر لوگوں کی جنسیت-مذہب اور عمر کا اندراج کرنے کے بعد باقی خانے سرسری طور پر بھرتے چلے جاتے ہیں—

یہ اسباب ہمارے ہاں کی مردم شماری کے نتائج کو مشتبہ بنانے کے لئے کافی ہیں اور اسی لئے ہمارے خیال میں ضروری ہے کہ تعلیم (خواندگی) اور زبان کا حساب عام مردم شماری سے جدا کر کے ان کے علیحدہ نقشے تیار کرنے کا مستقل انتظام کیا جائے اور اس دلچسپ اور قابل تحقیق امر کے متعلق بھی اعداد فراہم کئے جائیں کہ ہندوستان میں بولنے والوں کے علاوہ ان کی تعداد کتنی ہے جو اردو کو استعمال کرتے یا کم سے کم سمجھد سکتے ہیں؟

مندرجۂ بالا اعداد سے یہ تو ثابت ہوا کہ ہندوستان کے ان باشندوں کی تعداد جن کی مادری زبان اردو یا ہندوستانی ہے دس کرور کے قریب ہے اور اگر اس میں وہ لوگ بھی شامل کر لئے جائیں جن کی زبان راجستانی یا مارواڑی دکھائی گئی ہے اور ماہرین لسان اقرار کرتے ہیں کہ یہ بھی محض مغربی ہندی یا اردو کی ایک شاخ ہے تو اردو کے کل اہل زبان گیارہ کرور ہوتے ہیں اور ہماری زبان

دنیا کی سات سب سے بڑی زبانوں میں شمار ہو سکتی ہے*—

سواحل و جزائر افریقہ میں اکثر مقامات پر بازار کی زبان اردو ہے۔ بیرونی ممالک میں جہاں کہیں ہندوستان کے لوگ گئے۔ خواہ ان کی اصلی زبان کچھ ہی ہو۔ باہر اسی ہندوستانی زبان کو بولنے لگے۔ ان سب کی صحیح تعداد کا تخمینہ کرنا قریب قریب محال ہے۔ دوسرے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا۔ محکمۂ مردم شماری نے تو اتنی دردسری بھی نہیں اٹھائی کہ خود ہندوستان کے اندر "اردو فہمون" کا شمار دریافت کرتا۔ حالانکہ ملک کے اہل الرائے نہایت ممنون ہوں گے اگر اردو یا ہندوستانی کے متعلق اس قسم کے اعداد فراہم کئے جائیں کیونکہ اس براعظم میں قومی اور مشترکہ زبان بننے کی اگر صلاحیت ہے تو وہ اسی اردو زبان میں نظر آتی ہے—

ہمیں یہ تجویز پیش کرنے کی جسارت اس واسطے اور بھی ہوئی کہ ملکی حالات کو دیکھکر بظاہر حکام مردم شماری بھی اردو کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں مشترکہ قومی زبان کے مسئلے پر جن خیالات کا اظہار ناظم مردم شماری نے کیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ ذیل میں انکا خلاصہ نقل کیا جائے:—

مسٹر مارٹن لکھتے ہیں کہ بول چال اور میل جول کی ضرورتوں نے بعض چھوٹی زبانوں کی بجائے لوگوں کو ملک کی بڑی زبانیں استعمال کرنے پر مجبور کردیا ہے اور ایسے علاقوں میں جہاں مقامی بولیاں بالکل مفقود نہیں ہوئیں۔ وہاں بھی مستقل طور پر کوئی دوسری زبان رائج ہوگئی اور باشندے "ذولسانین" ہوگئے ہیں۔ ادھر گذشتہ دس سال میں تمام ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان کے امکان پر بھی بہت کچھ بحث مباحثے ہوتے رہے۔ اعداد سے ظاہر ہے کہ مشرقی اور مغربی ہندی بولنے والوں کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ ہے اور اگر انہی میں راجستانی اور بہاری کو شامل کرلیا جائے تو ہندی یا ہندوستانی والے شمار میں دس کرور سے بھی زیادہ ہوجاتے ہیں .... بہ الفاظ دیگر شمالی اور وسطی ہند میں کسی حد تک ایک مشترکہ زبان کا وجود پایا جاتا ہے اور یہی ہندوستان کے حصۂ اعظم کی "لنگوا فرینکا" بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مغربی ہند میں بھی جا بجا اس کے ہواخواہ پائے جاتے ہیں اور مثال کے طور پر بڑودہ کے مہتمم مردم شماری نے بعض دکنی ذاتوں کے اس عجیب دستور کا ذکر کیا ہے کہ وہ آپس میں ہندوستانی

---

* بولنے والوں کی کثرت اور علاقوں کی وسعت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی زبانیں حسب ذیل ہوں گی:—

چینی - انگریزی - اردو - جرمانی - روسی - عربی - ترکی (تاتاری)—

زبان ھی میں بات چیت کرتے ھیں-مگر اس زبان کی ادبی صورتیں ھنوز مصنوعی اور لامعیار ھیں کیونکہ ملک میں ایسی کتابیں ھی نہیں لکھی گئیں جنہیں یہاں کی قدرتی زبان کی پیداوار کہا جاسکے-اس بارے میں مسٹرایڈی لکھتے ھیں کہ" زبان دو طریق سے نشوونما پاتی ھے:(۱)عوام الناس میں نئے خیالات کی اشاعت سے اور یا (۲) اھل قلم کی محنت و سعی سے-اب جہاں تک تصانیف کا تعلق ھے-عام لوگوں کی بول چال پر ھندوستانی علم ادب کا کوئی اثر ھی نہیں پڑا-کیونکہ یہ علم ادب (جس میں اردو اور ھندی دونوں کتابیں شامل ھیں) جس قدر بھی ھے ایک ساختہ زبان میں ھے اور صرف ان لوگوں کی سمجھ میں آسکتا ھے جنھوں نے اسے مدارس میں باقاعدہ پڑھا ھو-ھندوستان میں انشاپردازی کی خوبی ھی یہ سمجھی جاتی ھے کہ تحریر میں مغلق اور پیچیدہ الفاظ بھرے ھوں........ ٹکسالی یا معیاری زبان کے بنانے میں نصاب تعلیم کی کتابوں اور سرکاری مطبوعات سے بھی مدد ملتی ھے اور یہ خاصی سادہ زبان میں لکھی جاتی ھیں اور بے شبہ ملک پر کچھ نہ کچھ اثر ڈال رھی ھیں-لیکن اس ضمن میں یہ گذارش کئے بغیر نہیں رھا جاتا کہ چند سال سے جو مدرسے کی کتابوں میں صراحتاً اس غرض سے " اعلی ھندی " اور " اعلی اردو " کی عبارتیں داخل کی جانے لگی ھیں کہ طلبہ جرائد کی زبان سے مانوس ھوجائیں- یہ ترقی معکوس ھے-جرائد کو لوگوں کی زبان کا پابند ھونا چاھئے نہ کہ لوگوں کو جرائد کی زبان کا........ باقی اس میں کلام نہیں کہ جرائد کی مدد کے بغیر یکساں زبان کا رواج پانا دشوار ھے اگر چہ یہ کہنا کہ جرائد کا گذشتہ دس سال کے اندر کوئی مفید اثر پڑا فقط حسن ظن نظر آتا ھے * -

مغربی ھندوستان کے متعلق مسٹر مکرجی لکھتے ھیں کہ بودو باش کی ضرورتوں سے دکنی لوگوں نے گجراتی سیکھ لی ھے اور اکثر اسے بول بھی سکتے ھیں لیکن خود گجراتی لوگ دوسری زبان سیکھنے پر زیادہ مائل نہیں-خاص کر مرھٹی سے مطلق انس نہیں رکھتے-مغربی ھند کے مسلمان عام طور پر اردو بول سکتے ھیں مگر بہت کم ھیں جو اسے لکھنا بھی جانتے ھوں-ھندی تعلیم یافتہ طبقوں میں یقیناً قبولیت رکھتی ھے لیکن اس کا رواج ابھی اتنا عام نہیں کہا جاسکتا جتنا

---

* مسٹر ایڈی کی یہ سب رائیں اگر بجنسہ مان لی جائیں تو بھی اس مسئلہ کا سب سے ضروری پہلو انہوں نے نظر انداز کر دیا اور وہ یہ ھے کہ عام جہالت اور افلاس کے باعث ملک میں ۹۵ فیصدی سے زیادہ باشندے ایسے ھیں جو کسی اخبار یا کتاب سے خواہ اس کی زبان سہل ھو یا دشوار کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتے اور ان کے بول چال پر کسی تحریری زبان کا اثر نہیں پڑسکتا— ھاشمی

انگریزي کا تاهم اسکے "لنگوا فرینکا" بن جانے کے دعوے میں قوت آتی جاتی هے- زبان ثانوي کی حیثیت سے اسے مدارس میں داخل کرنے کی عام خواهش هے اور تعلیم یافته هندو مسلمانوں میں دوستانه روابط بڑهنے کے ساتهه ساتهه هندی اردو کے مناقشے کی شدتیں کم هوگئی هیں- مسلمان فارسیت چهوڑ کر اپنی اردو کو سهل بنا رهے هیں اور هندو سنسکرت پرستی سے جس کا اعلیٰ هندی کی تحریک کے وقت بڑا زور تها کنارہ کرنے پر مائل نظر آتے هیں........"

(رپورٹ مردم شماری- باب نهم- فقرہ ١٦٥)

اگر چه حکام مردم شماری نے اردو بولنے اور سمجهنے والوں کی مجموعی تعداد معلوم کرنے پر توجه یا "زبان" کے مختصر باب (نهم) میں کوی بحث نهیں کی لیکن هم نے انهی کے فراهم کردہ اعداد کی مدد سے ایک نقشه تیار کیا هے جس سے "اردو فهموں" کے کل تعداد کا اندازہ کیا جا سکے- اس غرض کے لئے ان لوگوں کو بهی اردو سمجهنے والوں میں محسوب کر لیا گیا هے جن کی مادري زبان رپورٹ میں پنجابی- سندهی یا گجراتی دکهائی هے کیونکه اردو سے قریبی لسانی تعلق کے علاوہ ان زبانوں کے بولنے والے کم سے کم اردو کو سمجهه سکتے هیں بلکه غیر زبان والوں سے بالعموم اردو هی میں بات چیت کرتے هیں- یه بالکل ممکن هے که بعض سندهی- گجراتی یا پنجابی دیهات کے باشندے زبان اردو کے سمجهنے سے بهی مطلق عاری هوں لیکن اس کے مقابلے میں خالص بنگالی اور مرهٹی وغیرہ کے علاقوں میں بهت سے مقامات پر اردو فهم پائے جاتے هیں جن کو ذیل کے نقشے میں شمار نهیں کیا گیا اور اس لئے امید هے که همارے مستخرجه نتائج اصلیت سے کچهه بهت بعید نه هوں گے:—

زبان		کل آبادي میں فیصدی تعداد
اردو بولنے والے	مغربی هندی	٦ ء ٣٠
	راجستانی	٠ ء ۴
	پهاڑی	ء ٥
	مشرقی هندي	ء ۴
اردو سمجهنے والے	پنجابی	١ ء ٥
	گجراتی	٠ ء ٣
	سندهی	٠ ء ١
اردو بولنے اور سمجهنے والوں کی میزان		٦ ء ۴۴

اس طرح ھندوستان کی کل آبادی میں کچھ کم ۴۵ فیصدی یعنی تقریباً ۱۴ کرور نفوس زبان اردو کے دائرے میں داخل ھیں-جن میں سے دو تہائی کی مادری زبان اردو ھے اور ایک تہائی اگرچہ دوسری زبانیں بولتے ھیں مگر اردو کو بھی استعمال کرتے یا سمجھہ سکتے ھیں —

میں نے ایک اور نقشہ صوبہ‌وار تیار کیا ھے-یعنی ھندوستان کے مختلف علاقوں کی آبادی (کسرات چھوڑ کر) دکھائی ھے اور اس میں مذکورۂ بالا اصول پر اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی فیصدی تعداد پیش کی ھے-رپورٹ کی اصطلاح "مغربی ھندی" کی جگہ اس نقشے میں "اردو" درج کیا ھے-ورنہ سب اعداد رپورٹ مردم شماری کے باب اول (نقشۂ ذیلی نمبر ۳) اور باب نہم (نقشۂ نمبر ۲) سے ماخوذ ھیں—

نام صوبہ	اردو داں	اردو فہم	کل بولنے اور سمجھنے والے	کیفیت
۱-اجمیر (آبادی ۴ لاکھہ ۹۵ ھزار)	راجستانی } فیصد اردو } ۹۸	...	۹۸ فیصدی	
۲-آسام (۷۹ لاکھہ ۹۰ ھزار)	اردو] ۶	...	۶	
۳-بلوچستان (۸ لاکھہ)	اردو] ۲	بلوچی سندھی پنجابی } ۴۲	۴۴	
۴-بمبئی (۲ کرور ۶۷ لاکھہ ۵۰ ھزار)	اردو] ۵	گجراتی سندھی خاندیسی } ۴۱	۴۶	
۵-بنگالہ (۴ کرور ۷۵ لاکھہ)	اردو] ۴	...	۴	
۶-بہار و اڑیسہ (۳ کرور ۷۹ لاکھہ ۵۰ ھزار)	اردو] ۶ء۶۶	...	۶ء۶۶	
۷-بڑودہ (ریاست) (۲۱ لاکھہ ۲۶ ھزار)	اردو] ۳	گجراتی] ۸۷	۹۰	

نام صوبه	اردو داں	اردو فهم	کل بولنے اور سمجھنے والے	کیفیت
۸- پنجاب (۲ کرور ۵۰ لاکھه)	اردو، راجستانی } ۱۷	پنجابی، پهاڑی } ۶۵	۸۲	
۹- ٹراونکور (ریاست) (۴۰ لاکھه)	...	...	...	
۱۰- حیدرآباد (ریاست) (۱ کرور ۲۵ لاکھه)	اردو، راجستانی } ۱۲	مرهٹی*] ۲۶	۳۸	* ریاست حیدر آباد کی سرکاری زبان اردو هے اور عام طور پر یہاں کے باشندے اردو سمجھتے هیں خاصکر مرهٹ واڑی کے لوگ- لیکن میں نے اس تخمینے میں از رہ احتیاط صرف مرهٹی والوں کو اردو فهموں میں شمار کیا-
۱۱- دهلی (۴ لاکھه ۸۸ هزار)	اردو، راجستانی } ۹۶	پنجابی، وغیره } ۳	۹۹	
۱۲- ریاست هاے راجپوتانه (۹۸ لاکھه ۴۴ هزار)	راجستانی، اردو } ۹۴ ، ۶	...	۹۴ ، ۶	
۱۳- صوبهٔ سرحدی (۵۰ لاکھه ۷۶ هزار)	اردو، پنجابی+، راجستانی } ۵ ، ۶	مغربی پنجابی+ } ۴۱	۴۶ ، ۶	+ اس علاقے میں پنجابی کے اهل زبان اردو هی بولتے هیں اور مغربی پنجابی والے عام طور پر اردو سمجھتے هیں-
۱۴- صوبهٔ متحده (۴ کرور ۶۵ لاکھه)	اردو] ۹۹ ، ۷	...	۹۹ ، ۷	

نام صوبہ	اردو داں	اردو فہم	کل بولنے اور سمجھنے والے	کیفیت
۱۵-صوبۂ متوسط و برار (۱ کرور ۵۹ لاکھہ)	اردو / راجستانی } ۶ ، ۵۹	---	۶ ، ۵۹	
۱۶-گوالیار (ریاست) (۳۱ لاکھہ ۸۶ ہزار)	اردو / راجستانی } ۶ ، ۹۷	...	۶ ، ۹۷	
۱۷-کشمیر (ریاست) * (۳۳ لاکھہ ۲۰ ہزار)	اردو / راجستانی } ۵ ، ۲۵	کشمیری / پنجابی } ۶۰	۵ ، ۸۵	* اس ریاست کی بھی سرکاری زبان اردو ھے اور عام طور پر لوگ اسے سمجھتے ھیں-
۱۸-کوچین (ریاست) (۹ لاکھہ ۷۹ ہزار)	...	...	...	
۱۹-مدراس (۴ کرور ۲۸ لاکھہ)	اردو] ۳ ، ۲	---	۳ ، ۲	
۲۰-میسور (ریاست) (۵۹ لاکھہ ۷۸ ہزار)	اردو] ۵ ، ۵	...	۵ ، ۵	
۲۱-ریاست ہاے وسط ہند (۶۰ لاکھہ)	راجستانی / اردو } ۲ ، ۸۵	گجراتی] ۱	۰ ، ۸۶	

سویڈی ادبیات میں رومان کی حیثیت

از

(جناب مسز صالح حیدری آی-سی-ایس)

(یہ مضمون مسٹر صالح حیدری آی-سی-ایس فرزند اکبر جناب مسٹر محمد اکبر حیدری المخاطب بہ نواب حیدرنواز جنگ بہادر ممبر فنانس کی اھلیۂ محترمہ نے میری درخواست پر اردو کے لئے تحریر فرمایا-خاتون موصوف اعلے درجہ کی تعلیم یافتہ اور ادیب ھیں- سویڈی ان کی مادری زبان ھے-انگریزی اور فرانسیسی کی بڑی عالم اور انشاپرداز ھیں اور ان کے علاوہ اور بھی کئی زبانوں سے بہت اچھی طرح واقف ھیں-یہ مضمون انھوں نے انگریزی میں لکھہ کر عنایت فرمایا تھا-اس کا طرز بیان پرزور نقادانہ اور ادیبانہ تھا-ترجمہ آسان نہ تھا-لیکن پروفیسر وھاج الدین صاحب (اورنگ آباد کالج) نے اپنی مہربانی سے بہت خوبی سے اس کا ترجمہ کیا ھے — اڈیٹر)

برگسن کا دعوی ھے کہ " حیات عجائبات کے پے در پے ظہور کا نام ھے "- غور کرو تو اس مقولہ میں صداقت نام کو بھی نہیں پائی جاتی-اس کے مقابلہ میں تو فرانسیسیوں کا یہ قول کہیں زیادہ حقیقت پر مبنی ھے " کہ جتنا زیادہ اشیاء میں تغیر ظہور پزیر ہوگا اتنی ھی وہ بالاصل ایک سی نظر آئیں گی-سویڈی ادبیات کا یہی حال ھے-عام یورپی ادبیات کی طرح اس میں بھی ادبی مذاھب کی بوقلمونی نظر آتی ھے-ھر گروہ دوسرے کی مخالفت میں سرگرم نظر آتا ھے-ھر ایک کی یہی کوشش ھے کہ " نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کردے "—

ھم میں بھی اکثر قدیم اور جدید ادیب ایسے گذرے ھیں جو افلاطون کے خشک مذھب " عقلیت " کے پیرو رہ چکے ھیں-ان میں " شعر کش " شخصیتیں بھی نظر آتی ھیں اور گندم نمائی اور جو فروشی کرنے والے جھوٹے منطقی بھی موجود ھیں-ان میں بھی کئی والٹیر (Voltaire) پیدا ہوچکے ھیں یا کم از کم والٹیری مذھب کے پیرو جو شیکسپیر پر دائرۂ متانت سے باھر نکلنے کا الزام لگاتے ھیں اور

کہتے ہیں کہ " ساحرات نظم (Muses) کی حیثیت اس کی (شیکسپیر) نظروں میں کرتب دکھانیوالی نٹنیوں کی سی ہے جو تنے ہوے رسوں پر ناچتی پھرتی ہیں "—

ان ادیبوں کے مقابلہ میں ہمارے یہاں جدید رومان نگاروں کا ایک ایسا گروہ بھی ہوچکا ہے جو ہر چیز میں والٹیر کا ضد تھا-ان لوگوں نے کوشش کرکے فنی تکلف کی ہموار مگر اکتا دینے والی سطح کو جابجا سے اکھاڑ پھینکا ہے اور آزادی کے ساتھ جذبات وتخیلات کی دلچسپ شوخیوں اور چھلوں پر اتر آئے ہیں- رومانیت کی یہ تحریک چونکہ خود اپنے مقصد سے خبردار نہ تھی اس لئے یہ بہت جلد " بلند پروازی" اور " انیلے پن " کے رنگ میں ڈوب کر رہ گئی-ہمارے ابتدائی رومان نگار " فردوس " کے مناظر کا خواب دیکھا کرتے تھے-ان میں فطري خودرو اور سادگی آمیز غرور و طنیت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا-لیکن پھر بھی وہ حقیقت اور " واقعیت " کی دنیامیں رہتے تھے-برخلاف ان کے ہمارے آتشبازوں یعنی جدید رومانیت کے مقلدوں نے تو سرے ہی سے اس عالم خاکی سے ہاتھ دھوڈالا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عدم کو اپنا گھر بنا بیٹھے-اس تحریک میں مرکزیت کا ظہور رفتہ رفتہ ہوا ہے اور سنجیدگی اور فنی کمال کی صفتیں جو انیسویں صدی کے سویڈی ادبیات کا طغراے امتیاز سمجھی جاتی ہیں اس میں بتدریج پیدا ہوئی ہیں—

——:o:——

مثال کے طور پر آسکر لورتین (Oscar Levertin) کو لو-یہ ایک سویڈی یہودی تھا اور دوسری قومی صفات کے دوش بدوش " حزن ویاس " کا بھی بہت کچھ حصہ اسکی فطرت میں موجود تھا-روکوکونوویلر (Rokoko Noveller) اسی کی ایک ظرافت آمیز اور پر جوش تصنیف ہے اور اس میں شاہ گستاف ثالث کے دربار کی زندگی کا چربہ اتاراگیا ہے- اسکی نظمیں پرجوش دھقانی شاعری کے جواہر ریزے ہیں-ہمارے شمالی شہروں کی طرح جو ایک پر اسرار شفق کی چادر میں لپٹے ہوئے رہتے ہیں اس کا کلام بھی جوش اور ہمدردی کی تابش لے مالا مال ہے- جیسا کہ خود لورتین کا قول ہے "——اس کی نظمیں اس سیاہ ماتمی لباس کی طرح ہیں جس میں ارغوانی رنگ کی سیون جھلکتی ہو"-اپنی ایک نظم "Carence" کا آغاز وہ اس طرح کرتا ہے:—

" آج جشن عید ہے اور عید کا آخری روز
جب کہ ' غم ' کا لباس شہانہ ہے
اور ' عیش ' سیاہ پوش ہے ان
تمام مرے ہوئے لوگوں پر افسوس ہے

جو محبت کرنے کے لئے دوبارہ زندہ
نہ ہوں گے"—

—:o:—

ورنر-و-های‌ڈن‌استیم (Verner V. Hiedenstam) بھی انیسویں ہی صدی کا شاعر ھے-شوق‌سیر - اور جمال پرستی - یہہ چیزیں اس کے طغرائے امتیاز ھیں- اسی صدی کا ایک اور شاعر گستاف فروڈنگ (Gustaff Froding) ھے-جس کی عجیب و غریب خصوصیت "انفرادیت" ھے- وہ فضا جس پر انیسویں صدی کے آخری ربع میں کہر اور ظلمت مسلط ہوچکی تھی اسی کے تازہ و با کمال کلام سے منور ھوئی-اس نے ترانوں سے اپنے ہم عصر ادبی اور سماجی نقادوں کے کان کھڑے کئے اور یہہ کچھہ اس انداز سے بلند ھوئے کہ ان کی بلند آھنگی ان حضرات کو پسند نہ آسکی-کہتا ھے:—

" نئے اور برق صفت خیالات آن پہنچے-ان سے
ہر کونے میں جگمگاهت اور اجالا پیدا ھوگیا-
پرانی اور فرسودہ شمعوں نے آواز بلند کی
گھر میں آگ لگ گئی ھے اسے بجھاؤ بجھاؤ !
ڈھونکیاں استعمال کرو......گلگیر کو طاق پر رکھدو"

—:o:—

غالباً یہ کہنا بیجا نہ ھوگا کہ ھماری رومانی تحریک کی سب سے زیادہ باکمال اور فنی اعتبار سے بہترین مظہر مس سیلم لاگرلوت کی وہ تصنیف ھے جو"گوستا برلنگ کی داستان" کے نام سے مشہور ھے-یہ داستان جیوٹ اور بہادری کے قصوں کا ایک سلسلہ ھے-تخیل کی بھینی بھینی بوباس کو ذرا زیادہ تیز کرنے کی غرض سے کہیں کہیں ھیبت اور خوف کی آمیزش بھی کردی گئی ھے- بے فکری کے قہقہے بھی ھیں-گوستا برلنگ کتاب کا ھیرو ھے جو نیم شاعر اور نیم رند ھے-یہ غوغائیوں اور رنگیلوں کی ایک بڑی جماعت کو لے کر اٹھتا ھے اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی بے باکانہ جسارتوں کا ڈنکا بجوا دیتا ھے-ان قصوں میں ہم کو اس زمانے کی بولتی چلتی تصویریں نظر آتی ھیں جب بے فکری اور عیش و عشرت کا راج تھا اور"بانکوں" کے لئے کھانے کی میز سے اٹھکر سیدھے کمرۂ عدالت کا رخ کرنا اور ناچ کی محفلوں سے اٹھکر شراب کی گرما گرم مجلسوں میں شریک ھونا ایک معمولی سی بات تھی-یہ سب قصے اس وقت کے ھیں جب خلیج ریمن کے کنارے مستقلاً رنگ رلیوں اور رقص و سرود کے لئے وقف تھے—

—:o:—

مس لاگرلوف کا اسلوب بیان انوکھا اور دلکش ھے-لیکن افسوس ھے کہ بعد کی تصنیفات میں یہ رنگ کسی قدر پھیکا پڑگیا ھے-بلکہ کہیں کہیں تو اس نے تصنع اور آورد کی شکل اختیار کرلی ھے-پھر بھی گوستا برلنگ کی داستان بھولنے والی چیز نہیں اور جہاں کہیں بھی سویڈی اور رومان کا ذوق رکھنے والے موجود ھوں گے اس کتاب کا مطالعہ اور اس کی وقعت برقرار رھے گی-تنقید نگاروں اور عوام کے حلقہ میں اس کتاب نے جو ھردلعزیزی حاصل کی اس کا کچھہ اندزہ اسی سے ھوسکتا ھے کہ شائع ھوتے ھی اس کتاب کی بدولت (ور یہ مس لاگرلوف کی پہلی تصنیف ھے) مصنفہ کو نوبل پرائز کا مستحق سمجھا گیا—

اس کے بعد کارل‌ایرک فارسلینڈ کا نام آتا ھے-اس مصنف کو ھم جائز طور پر اپنا جدید روسو (Rousseau) کہہ سکتے ھیں-اس کا راگ دیہاتی فضا کی دلکشیوں سے لبریز ھوتا ھے-سفید تختہ بندی کیا ھوا سرخ رنگ کا جھونپڑا-گرد و پیش کے مرغزار-دھوپ میں پھریرے لیتا ھوا سفید جھنڈا-ھری ھری دوب پر مزے مزے سے چرتی ھوئی چتکبرے رنگ کی گائیں-یہ اور ایسی ھی چیزیں اس کے راگوں کا موضوع ھیں-وہ ان ھی چیزوں کے متعلق الاپتا ھے اور کچھہ ایسے لگتے ھوئے میٹھے سروں میں الاپتا ھے کہ ھمارے شہری ان سے متاثر ھوکر ھر سال موسم بہار میں گروہ در گروہ دیہاتی زندگی سے لطف اندوز ھونے کے لئے جاتے ھیں اور جب یہ لوگ واپس آکر قہوہ خانوں-جگمگاتی ھوئی دوکانوں-مختصر یہ کہ تہذیب و تمدن کی جملہ آسائشوں سے دو چار ھوتے ھیں تو اطمینان کی سانس لیتے ھیں:—

"جب شاعر کی چشم بصیرت کھلتی ھے تو اسے بیری
کی جھاڑیوں پر نظمیں لٹکتی ھوئی نظر آتی ھیں
جب شکسپیر کا گزر ھوتا ھے تو پورا بازار کا
بازار سوانگ بھرنے لگتا ھے"—

———:o:———

حریف ادبی مذاھب اور جھگڑتے ھوئے عامی حلقوں کی خیرہ کن روشنی سے دو چار ھوکر ھماری نگاھیں اکثر ایک حقیقت کو نظر انداز کر دیا کرتی ھیں اور وہ حقیقت "قومی روح" ھے-دیر ھو یا سویر-کبھی نہ کبھی ھر قوم اپنی ھستی سے ضرور خبردار ھوتی ھے-سنساری (Cosmopolitan) اثرات اپنا عمل ضرور کرتے ھیں لیکن رفتہ رفتہ یہ چیزیں منظر عام سے غائب ھوتی جاتی ھیں اور غیر ملکی اثرات کی کورانہ کشمکش کے پیچھے سے ایک نئی شخصیت نمودار ھوتی ھے اور بتدریج اپنے خمیر اور اپنی مخفی خواھشات سے خبردار ھوتی جاتی ھے-اخلاقی اور فنی نقطۂ نگاہ سے اگر قومیت کا یہ ظہور ایسے زمانے میں ھوا ھو جو ذھنی جد و جہد کا

زمانه هو تو قومی مزاج پر بھی اس کا اثر ضرور پڑتا هے اور "ضبط خودی" اور ٹھنڈے دل سے استدلال کرنے کی صفات جو تمام قدیم ادبیات کی نمایاں خصوصیتیں هیں۔اس میں همیشه کے لئے باقی رہ جاتی هیں۔چنانچه فرانس میں یه هی هوا۔ فرانسیسی ادب کی دیوی انقلابات و تغیرات کے باوجود اب بھی "ملکه" بنی هوئی هے۔لطافت کی جھلک اور منطق کا ناقابل محو شائبه اس میں آج تک برقرار هے۔ انگلستان میں "قومی انا" کی تشکیل ایسے وقت هوئی جب جذبات کے دریا جوش مار رهے تھے اور نتیجه یه هوا که آج تک انگریزی ادبیات کی ایک اپنی خصوصیت باقی چلی آتی هے—

——:o:——

اگر اسی خیال کو استعارہ کی زبان سے سننا چاهتے هو تو یوں سمجھو که انگلستان میں "ادب کی دیوی" ایک مرتبه چمکی اور قومی شعور سے اس طرح ابھری جیسے که یونانی دیومالا میں می نروا (Minerva) قدیم دیوتا کے اندر سے ظاهر هوئی تھی۔لیکن همارى سویڈی ادب کی دیوی کا جنم اس سے مختلف طریقه پر هوا۔اس کی آمد بوق و قرنا کے شور اور جھانجھوں کی جھنکار میں نهیں هوئی وہ ایک حسین بچه کی طرح جھجکتی هوئی اور غیر ملکی رطب و یابس میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راسته ڈھونڈھتی هوئی ظاهر هوئی۔اس کی پیشانی پر الجھن کے آثار تھے اس کی نیم وا اور دھندلی آنکھوں سے یه ظاهر هوتا تھا که وہ اب تک بهشتی نظاروں کی یاد میں مشغول هے—

اسنائل سکی (Snoilsky) نے ایک نظم "اولڈ کنگ گوسٹ" لکھی هے۔ (گستاف واسا همارا سب سے پہلا جدید شاهنشاہ اور سیاسی نجات دهندہ هے)۔اس نظم میں شاعر نے اس حسرت بھری آرزو کی تصویر کھینچنی هے جو همارى دیوی کے دل میں جوش مار رهی هے که وہ کسی طرح گائے اور دل کا بخار نکالے:—

> "دروازے بند تھے اور باهر هزارها آدمیوں کے دل انتظار میں دھڑک رهے تھے۔جاڑے کی رات میں ایک پوری قوم باهر منتظر کھڑی تھی——اسکی مشکور اور احسان مند قوم جس کو اس نے نجات دلائی تھی یعنی اس کے سویڈی جن کے سینوں سے آواز تک نه نکل سکتی تھی که اس کے ذریعه سے وہ اپنی ضرورتوں کو اس پر ظاهر کریں—"

——:o:——

"ان کا راگ ان کی بہترین نذر اب تک مقید تھا۔

اس کے میٹھے بول ابھی تک 'زبان' کے قالب میں مصروف خواب تھے۔اس کو آرام اور تسکین دینے کے لئے تو یہہ راگ لطیف ترین نغموں کی شکل میں بہہ نکلتا لیکن چھلکتے ہوئے دل سے صرف ایک لکنت زدہ آواز نکلی"—

———:o:———

"وہ وقت تھا اور آج کا دن اس مدت میں ہمارے ساز میں کئی زریں تاروں کا اضافہ ہوا اور مقدس انگلیوں نے ان کو چھیڑ کر تمام مملکت کو نغموں سے معمور کیا ناآشناے کمال انگلیوں سے مس ہوکر یہ تار اب بھی لرزتے ہیں۔میری پیاری سویڈی زبان! اب تو گا سکتی ہے!"

———:o:———

انگلستان کی طرح ہماری سویڈی ادب کی دیوی نے جس زمانے میں کلکاریاں بھریں اور تتلا کر بولنا شروع کیا وہ وہ زمانہ تھا جب وجدان کا دور دورہ تھا اور صحیفۂ قومی کے اوراق پر تخیل جولانیوں میں مصروف تھا۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے جتنے شعرا حقیقی معنوں میں قومی شاعر کہے جاسکتے ہیں وہ سب کے سب بدرجۂ اولی رومانی (Romanticists) بھی تھے۔ان لوگوں نے ہمیشہ حریف اور مصروف پیکار "مذاہب" کی کشمکش سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے اور دونوں فریقوں کی بہترین صفات کو جذب کر کے اپنی ذاتی ذھانت سے اس کے عجیب و غریب نمونے تیار کرتے رہے ہیں۔اشیاے حیات ان کی نظروں میں حقیقی اور اصلی تھیں۔محض ایک خیالی بہشت کے پر فریب تصور میں آکر ان لوگوں نے حقیقت کو ہات سے دینا کبھی گوارا نہیں کیا۔ہاں یہ بے شک ہوا کہ گیٹی (Goethe) کی طرح کبھی کبھی ان لوگوں نے بھی "پستی حقیقت" سے اڑکر تخیلات کی زریں فضا میں پرواز کرنا ضروری خیال کیا ہے—

ان لوگوں نے سراب صفت خواھشوں کو کبھی اپنی جستجو کا انجام نہیں قرار دیا اور نہ ان کی تگ وپو کبھی ان کو بے سراغ سمندروں اور نا معلوم کناروں تک لے گئی۔ان سب کی جستجو نے ایک خاص شکل اختیار کی اور اپنا ایک خاص مقصد مقرر کیا۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے شعرا مثلاً اولاس پٹری۔تگنر۔وکٹر رڈبرگ۔زے کیریس توپی لی یس وغیرہ ہمارے سچے مصلح بھی ہوئے ہیں۔ظاھری اور

باطنی دونوں طریقوں سے ان لوگوں نے قوم کی رهنمائی کی هے اور دراصل یهی لوگ همارى قومی روح کی تشکیل اور تعئین کرنے والے هوئے هیں—

——:o:——

همارے روحانی مقتداؤں میں سب سے زیادہ محبت کے قابل وکٹررڈبرگ کی ذات تھی اوراب بھی هے-سنه ۱۸۷۷ ع میں الپسالا یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقع پر اس نے ایک نظم "Kantata" لکھی هے اور اپنی رجائیه تصوریت کا (Idealsim) ایک عجیب موثر اور پائدار طریقه پر اظہار کیا هے-میرا منظوم ترجمه اصل کے مقابلے میں نقل کی حیثیت رکھتا هے لیکن اظہار مطلب کے لئے چونکه کوئی اور وسیله نہیں هے-اس لئے اسی کو غنیمت جانکر درج کیا جاتا هے:—

"سنین ماضیه کی تاریک رات میں هوکر مختلف منزلوں
سے گزرتی هوئی-اے انسانیت تو ایک نا معلوم منزل
مقصود کی طرف لڑکھڑاتے هوئے قدموں سے بڑه رهی هے"—

——:o:——

"جس کو تم روز روشن سمجھے هوئے هو-وہ صرف ایک پھیکی
اور بھٹکتی هوئی روشنی کی جھلک هے-اس کے آگے
آگے اس سے بھی زیادہ دھندلی کہر هے اور تمھارے
پیچھے تاریک رات هے!"

اس کے بعد چند بہترین اشعار هیں جنھیں هات لگانے کی همت میں نہیں کرسکتی-ان اشعار میں شاعر بنی نوع انسان کو لق و دق بیابان میں کوسوں تک لے جاتا هے-قدم قدم پر غشی هے-چپه چپه پر دھڑکتے هوئے دل سے سوال نکلتا هے:—

"اے خدائے بزرگ و برتر! تو هم کو کہاں لئے جا رها هے
آسمان پر نظر دوڑاؤ-تم دیکھو گے-که هزارها آفتاب
غائب هوتے جاتے هیں-کتنی 'گشت هائے انجم' کٹتی چلی جاتی
هیں-دنیاوی نظام رو به فنا هیں-آوازیں آتی هیں که جو
کچھه هے بے بقا هے جسے تم 'زمان' کہتے هو اس کی
حیثیت محض ایک درمیانی اور وسیع قید خانے کی سی هے"-

——:o:——

"یه سب کچھه هے لیکن مایوس هوکر گر نه پڑنا! اپنی تلاش
کو ختم نه کر دینا!! جھنڈے کو مضبوط پکڑ لو اور یه امید
لئے هوئے بڑھے چلو که جو کچھه تم نے حق خیال کیا-جو کچھه تم نے

پیار و محبت سے کیا ان خوشگوار خوابوں پر 'زمان' کی دسترس نہیں ھو سکتی-یہ چیزیں تو تمہارے لئے مزرع اخرت و ابدیت ھیں "—

———:o:———

" ھے وہ روح جو شرافت اور صداقت کے شوق میں گھلتی رھتی ھے اس کی تہ میں ابدیت اعلی کا شعلہ رقص کرتا رھتا ھے خود غرضی چھوڑ دو تو وہ عکس الہی جو تمہاری روح میں ھے نسلاً بعد نسلاً روز افزوں 'کمال' حاصل کرتا رھیگا-صحرا نوردی میں کتنی ھی مدت کیوں نہ گزرے انجام میں تم 'کنعاں' ضرور پہنچ جاؤ گے "—

———:o:———

زے کیریس توپی لی یس کہتا ھے:—

" نغمہ کی تخلیق 'غم' سے ھوئی اور 'غم' ھی سے 'عیش' دریافت کیا گیا "—

حزن و ملال کا جو گہرا رنگ اس شعر میں جھلکتا ھے وہ ھمیشہ ھمارے قومی مزاج کو راس آیا ھے-ھمارے شاعروں میں تگنر نے اس " جہنمی تاریکی " کی مخالفت میں اپنی آواز بلند کی-اس نے کہا کہ " سچے سویڈوں کو یہ زیبا نہیں ھے-ھماری قومی زبان مردانہ ھے اس میں ھائے-وائے-دریغا-حسرتا وغیرہ کی گنجائش نہیں ھے شاعرانہ الہام کا اعلی ترین ماخذ غم و اندوہ نہیں بلکہ انبساط و سرور ھے "-لیکن خود تگنر نے تاریک ترین حزنیہ نظمیں لکھیں اور اپنے منہ سے اپنی تکذیب کی!!

اگر ھم اپنی شاعری کے اولیں اور خودرو نمونوں کو ٹٹولیں یعنی اپنی دھقانی شاعری اور عام ڈیٹوں پر نظر ڈالیں تو عملاً ھمیں ان میں سے ھر ایک میں حزن و یاس-اندوہ و الم کا نغمہ سنائی دے گا-کہیں موت اور بے رحمانہ قتل کی تصویر کھنچتی ھوئی نظر آئیگی-کہیں ایسے بچوں کا تذکرہ ھم کو ملے گا جو خون کے آنسو روتے تھے-ایک قصہ (Sven in the Rosegarden) ھے-اس میں ھیرو اپنے بھائی کو قتل کرتا اور اس بات کی قسم کھاتا ھے کہ وہ اس وقت تک واپس نہ آئے گا " جب تک ھنس راج سیاہ رنگ کے نہ ھو جائیں اور پتھر بہنا نہ شروع کریں "—

———:o:———

" تقابلی ادبیات " کے مطالعہ میں ھمیشہ ملکی اور قومی اثرات کے بجاے بین قومی اور سنبساری اثرات کو زیادہ وقعت دی جاتی ھے-اس میں شک نہیں کہ مغربی ممالک میں جو ادبی ارتقاء ھوا ھے اور اس میں جو کچھہ یکسانی پائی

جاتی ھے اس کی توجیه انہی سنساری اثرات سے ھوتی ھے-لیکن پھر بھی کیا یه خیال کرنا بعید از عقل ھے که ھر قوم اپنی کچھه "ذاتی گہرائیاں" بھی رکھتی ھے اور ان گہرائیوں کے اندر اس کی مشترکه روح کو تشکیل دینے والا مواد بھی موجود رھا کرتا ھے! اسی طرح سے میرا خیال ھے که "تصوف" اصلاً اور ابداً ھمارے قومی خمیر میں سرایت کر گیا ھے اور ھمیں تصوف اور تقویٰ کی تلقین کے لئے روسیوں کی ضرورت نہیں ھے حالانکه وہ وقتاً فوقتاً اس کا دعویٰ کرتے رھتے ھیں-ھم میں عجائبات قدرت کا احساس اور تقویٰ پیدا ھو جانے کی دو وجہیں ھیں-ایک تو یه که ھمارے ملک میں انسان کو بے تعداد حوادث سے مقابل ھونا پڑا اور دوسری بات یه که اسے اپنے سے کہیں زیادہ زبردست طبعی قوتوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا-مثال کے طور پر ان لکڑی کاٹنے والوں کو لو-جو ھمارے جنگلوں میں کام کرتے رھتے ھیں-لمبے لمبے شہتیروں پر سیدھے کھڑے ھوکر وہ اپنی اس حقیر ناؤ کو تیز رو پہاڑی نالوں کے دھارے پر ڈال دیتے ھیں-کوئی بے ڈول حرکت ھو جائے یا اندازہ میں ذرا سی بھی غلطی ھو تو تباھی کے منه میں گر پڑنا ان کے لئے یقینی ھے-لیکن یه لوگ برابر صبر و خاموشی کے ساتھه اپنی روزانه مشقتوں میں مشغول رھتے ھیں اور بہادری کے ساتھه موت سے کھیلتے رھتے ھیں-یا پھر ھمارے ان دھقانوں کی حالت پر غور کرو جو بحر منجمد شمالی کے نزدیک مرتفع سطحوں اور پہاڑوں کے ڈھلان پر رھتے ھیں جہاں گرمیوں بھر سورج نہیں چھپتا اور سردیوں میں به مشکل افق کے اوپر دکھائی دیتا ھے-گرمیوں میں ان میدانوں پر شفق کی گلابی چادر پھیل جاتی ھے اور سردیوں میں زمین پر کئی کئی فیٹ گہری برف نظر آتی ھے-راستے بند ھو جاتے ھیں اور غریب کسان اپنے جھونپڑوں میں حبس کی وجه سے مر جاتے ھیں-جہاں جاڑوں کا یه مطلب ھوتا ھے که بچارے کسان مہینوں جبریه بے کاری اور کاھلی کی حالت میں پڑے رھتے ھیں-جہاں بھیڑیا نادار کسان کی اکیلی گائے کو بھی باقی نہیں چھوڑتا اور صرف ایک رات میں پالا اس کی فصلوں کو تباہ کر ڈالتا ھے-ظاھر ھے که ان صورتوں میں انسان فطرت کو صرف خوشگوار یا غیر خوشگوار منظر ھی کی حیثیت سے نہیں جانتا-اسے وہ اپنا دوست اور شریک کار نہیں سمجھتا اس کی نظروں میں وہ ایک سخت گیر اور ناقابل فتح دشمن ھے جو اکثر پرخاش پر آمادہ نظر آتا ھے-مختصر یه که وہ فطرت کو ایک ایسی دیوی تصور کرتا ھے جس کی پرستش لرزتے ھوئے جسم اور دھڑکتے ھوئے دل سے کرنا چاھئے-یه لوگ شگون کے انتظار میں اس کے چہرے کو تکتے رھتے ھیں که آیا اس کا منشاء زندگی ھے یا تباھی-نئی امید ھے یا قطعاً مایوسی! ان کی نگاہ میں فطرت مردہ نہیں ھے-انہیں وہ ذریات کی ایک کثیر جماعت کے ساتھه دکھائی دیتی ھے

جو اسی کی طرح کبھی اچھے۔کبھی برے۔کبھی ملتفت بہ دوستی اور کبھی مائل بہ تباہی ہو جاتے ہیں—

———:o:———

یہی وہ حد ہے جہاں ہمارے ہمہ اوست کے عقیدہ اور ہمارے صوفیانہ خیالات کا آغاز ہوتا ہے۔یہی وہ نازک مقام ہے جہاں کم فہم لوگ شراب کا شکار ہو جاتے ہیں اور مذہبی "مجدوں" کے پھندے میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شراب کی مجلسوں اور مذہبی جوش میں خوف زدہ انسانیت کو روزانہ آلام زندگی سے کسی قدر سکون نظر آتا ہے—

———:o:———

ازمنۂ وسطیٰ کا جب خاتمہ ہوا تو ہماری "رومانیت" میں ایک عجیب بے تکا پن پیدا ہو گیا تھا اور ادبی نقطۂ نگاہ سے اس کا اعلیٰ ترین مظہر سینٹ بری گیٹا کی کتاب "تجلیات" "Revelations" ہے۔یہ خاتون ہمیشہ حضرت مسیح کے خیال میں رہتی تھی۔ان کو یہ اپنا شوہر سمجھتی تھی۔اولیا کے ساتھ بھی اس کو توسل تھا۔ان مقدس ہستیوں کا بیان ایسے درخشاں الفاظ میں کیا گیا ہے جو تصوفانہ تخیل سے منوّر ہیں۔فقدان تربیت کے باوجود ان "تجلیات" میں رقت اور درد و سوز کی عجیب و غریب کیفیت پائی جاتی ہے۔ہر جملے کی تہ میں ایک عجیب و غریب شخصیت کا نقش گہرا کھدا ہوا نظر آتا ہے۔ہر لفظ بجائے خود ایک ایسے پیغام کی حیثیت رکھتا ہے جو کسی دھڑکتے ہوئے دل سے تڑپ کر نکلا ہو یعنی ایک ایسے دل کا پیغام جس کے جذبات کا تلاطم انسانی ضبط و برداشت سے باہر ہے اور جس کو صرف ریاضت نفس اور انکسار و تواضع کی شدتوں ہی میں آرام و سکون کی شکل نظر آتی ہے۔اس کتاب میں ہمیں "طبیعیت" (Naturalism) اپنی لفظی حیثیت میں نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ استعارات کی ایک ایسی پھلجھڑی چھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے جو اپنی تصور آفرینی اور جذبات انگیزی میں ہرگز کسی جدید سے جدید ترین لفظی تصویر کے مقابلے میں حقیر نہیں کہی جا سکتی—

———:o:———

امانوئل سویڈن برگ نے اپنے تصوفانہ معتقدات کو ایک روحانی مذہب کی شکل میں منتظم کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے متعلق عام اعتقاد یہ تھا کہ وہ ملائکہ سے ہمکلامی کیا کرتا ہے! ان کو وہ انسانوں کا روحانی مقتدا خیال کرتا تھا

برخلاف اس کی دوسرا گروہ اسے صرف ایک سفلی ساحر اور پر اسرار عملیات کا ماہر جانتا تھا۔آج اس کا نام تمام دنیا میں مشہور ہے اور معرفت الٰہی کی جدید شاخ ''تھیاسوفی'' کے عقیدت مند اسے اپنا زبردست ترین نبی مانتے ہیں—

—:0:—

اتو لف جونس سب سے پہلے گذشتہ جنگ کے زمانہ میں منظر عام پر آیا۔اس نے ''رتھیدس'' کے نام سے ایک افسانہ لکھا ہے اور اس چیز نے اسے بات کی بات میں معمولی شعرا کی سطح سے کہیں زیادہ بلند کردیا۔بیسویں صدی میں ادبیات کی جو ''دیوانی ھانڈی'' تیار کی گئی ہے اس کے مقابلہ میں اگر اس کتاب کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس میں بلند پایہ رومانیت کو نہایت دلکش اور انوکھے پیرایہ میں نباھا گیا ہے۔''وراثت'' تمام افسانہ نگاروں کا قدیم ترین اور عزیز ترین موضوع ہے۔اسی بنیاد پر جونس نے بھی اپنے مخصوص انداز میں ایک افسانہ تیار کیا ہے۔تاریک اور ڈراونے جنگلوں کی ''زمین'' پر تصوفانہ واقعات کی گلکاری کی گئی ہے۔اس جنگل میں اگر جاؤ تو کہیں کسی مقام پر انگارہ جیسی آنکھوں والا بن بلاو بیٹھا نظر آتا ہے۔کہیں صبا رفتار سفید رنگ کا بارہ سنگھا تڑپ کر نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور صرف نازک موقعوں پر ''برگزیدہ'' شخصیتوں ھی کو نظر آسکتا ہے۔اس رزمیہ (Epic) میں جو خیالی ہونے کے باوجود حقیقت آمیز معلوم ہوتا ہے۔ ھمارے دشت و جبل کی تصویر نظر آتی ہے۔ھماری نوآبادیات کے منچلے اور تقدیر پرست نوجوان اس میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔مختصر یہہ کہ اس میں ان تمام مرعوب کن قوتوں کا ذکر ہے جو انسانی ذھن میں جنم لیتی ہیں اور آخر میں انسان کی مختصر سی زندگی کو سنوارتی یا بگاڑتی ہیں—

—:0:—

نہیں ! ہم نے روسیوں سے ہرگز تصوف نہیں سیکھا اور نہ ھمیں اسکی ضرورت ہے کہ بائرن ھمیں ملحدانہ جبر و استیصال کا فلسفہ سکھائے کہ کاغذ پر معاشری عمارت کس طرح ڈھائی جاتی ہے اور اس کے کھنڈروں پر اپنے نفوس کے اداس مجسموں کو کیونکر قائم کیا جاتا ہے ! بائرن سے پہلے اور نیز اس کے بعد بھی ھماری ادبیات میں ''انا'' کی قسم کے بہت سے ہیرو گزرچکے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی شاندار تکلفات میں برباد کردی اور پریشان کن خیالات سے بھاگ کر ''منچلے کارناموں'' کے دامن میں پناہ لی۔ ''ھینس اے لی نی یس'' اسی قماش کا ہیرو ہے اور گستاف فروڈنگ کے ''شاعر-بانکے'' بھی اسی قسم کے ہیرو ہیں۔کیا یہہ مقام

تعجب نہیں کہ اس قسم کے ادبی رجحان کے باوجود نطشے (Neitzsche) کو ہمارے ملک میں زیادہ تعداد میں مقلد نہ میسر آسکے؟ شاید اس کی وجہ یہہ ہو کہ جس چیز کو نطشے منتظم حیثیت میں پیش کرکے فلسفیانہ وقعت دینا چاہتا تھا وہ ہمارے یہاں محض ایک شاعرانہ "اپچ" یا پھر "رومانی رجعت" کی حیثیت رکھتی تھی اور جب ہم اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے تھے تو خود شرمندہ ہوجاتے تھے —

———:o:———

بائرن اور روسیوں کی ضرورت سے خواہ ہم بے نیاز رہے ہوں - لیکن ابسن کی ضرورت ہمیں بے شک رہی ہے اور یہہ اس لئے کہ ہماری مبہم اور باغی "ذہنی پروازیں" ایک مستقل شکل میں ظاہر ہوسکیں - اس نے ہمارے جذبی مسائل کو کچھہ اس انداز سے حل کر دکھایا کہ ہم خود نہ کرسکتے تھے اور نہ کسی اور نے کیا - پھر بھی معموں کا جو حل اس نے ہم کو بتایا وہ اگرچہ کہیں کہیں پر ٹھیک اترتا ہے جیسے Peer Gynt میں - لیکن اکثر اوقات (کم از کم مجھے) غلط نظر آتا ہے - اس کی مثال اس کی کتاب Doll's House گڑیاخانہ ہے - جس چیز کو وہ لیتا ہے اسے وہ حل کی حد تک لے جاتا ہے لیکن وہاں اسے چھوڑ دیتا ہے - اس میں شک نہیں کہ فنی نقطۂ نگاہ سے یہہ چیز ضرور قابل تعریف ہے لیکن اکثر اس کا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ ناظرین جتنے آغاز میں حیرت زدہ نہ تھے اتنے خاتمہ پر رہ جاتے ہیں!

ہم لوگ "فرانسیسی طبیعیت * (Naturalism)" "Le mal de Siecle" (موجودہ صدی کے عیوب) اور اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں - گویا کہ مذہب طبیعیت محض فرانسیسیوں کی دریافت کی بدولت وجود میں آیا یا عیوب صدی صرف اسی قوم کا حق ہے! غالباً یہی وجہ ہے کہ بلزاک اور فلوبرٹ اور اسی مذہب کے دوسرے مصنفین کا مطالعہ ہمارے ملک میں بہت انہماک کے ساتھہ کیا گیا اور ہمارے مصنفین نے بعض اوقات اپنی فطرت اور تجربے کے خلاف اس کی تقلید کی - (Strindenberg) اسٹرن ڈن برگ کی طرح ہمارے کچھہ مصنفین ایسے بھی ہوئے ہیں جو ان خیالات کو اپنی فطرت میں لئے ہوئے پیدا ہوئے ہیں - یہہ شخص بہت ذکی الحس تھا - اس کا باپ ایک سیول ملازم اور اس کی ماں ایک ادنیٰ درجہ کی ملازمہ تھی - اس کی تربیت و پرورش نے زندگی کی ادنیٰ اور پست سطح کا نقش اس کی طبیعیت پر کچھہ ایسا گہرا بٹھایا کہ وہ اپنی تمام عمر کے لئے آدم بیزار بن گیا اور

---

* یہہ عقیدہ کہ ہر کام طبیعی علل ومعلول کے سلسلہ میں جکڑا ہوا ہے کوئی چیز مافوق الفطرت یا ایسی نہیں ہے جس کی توجیہہ طبیعی اسباب سے نہ کی جاسکتی ہو - مترجم -

آدم بیزار بھی ایسا جو بقول ٹسکن شاعر اے ری ٹی نو کے "سوائے خدا کے سب کو برا بھلا کہتا رہا اور خدا کو بھی محض اس عذر پر کچھ نہ کہا کہ' میں اسے جانتا ھی نہیں' !"—

اپنی ناول Inferno (انفرنو) میں وہ کہتا ھے :—

"میں نے اوائل عمر سے خدا کی تلاش کی۔لیکن مجھے شیطان ملا
میں نے (حضرت) عیسیٰ کی صلیب کو لڑکپن میں اٹھایا
اور میں نے اس خدا سے انکار کیا جو ایسے غلاموں پر
حکومت کرتا ھے جنھیں اپنے ایذا دینے والے سے محبت ھے"—

—————:o:—————

اس کا قول تھا کہ " میں تنہا ھوں " اور آخر تک اس نے اپنے مصائب کو تنہا برداشت کیا۔کہتا ھے :—

"مجھے ندامت و پشیمانی کا کیا حق ھے ؟ اپنی قسمت پر
مجھے اختیار نہیں رہا ھے۔میں نے شر کو کبھی شر
سمجھکر استعمال نہیں کیا بلکہ محض ذاتی حفاظت میں
پہچانتا گویا رب کی نکتہ
چینی کرنا ھے جس نے گناھوں کو ھمارے لئے بطور
عقوبت کے مقرر کیا ھے تا کہ وہ کیفیت تنفر
جو برے افعال کرنے سے ھوتی ھے ھمیں پاک و صاف کردے۔"

—————:o:—————

اس کی خامیوں کا یہ استعدار اگرچہ اس کو بری نہیں کرتا لیکن کم از کم اس کے نقطۂ خیال کی اس سے تشریح ھو جاتی ھے۔تلاش حقیقت کا عشق اسے جنون کی حد تک لے گیا۔اس کی وجہ سے اسے عجیب و غریب راستے طے کرنا پڑے۔وہ جنت کو تلاش کرتا ھوا دوزخ کے راستہ سے گزرا۔اس "سفر" میں جو کچھ واردات قلبی اس پر طاری ھوئیں۔انھیں وہ کھل کر بیان کرتا ھے۔اس کے اس بیان کو محض تصنع مت سمجھو۔اس سے اس کی ایک عجیب و غریب خواھش کا پتہ چلتا ھے کہ پہلو کو چیر کر وہ اپنا خون آلود دل نکالے اور دنیا کو دکھا دکھا کر اس کی برائیاں کرے۔ اس کے ساتھ ھی ساتھ وہ دنیا سے ڈرتا بھی ھے اور اس سے نفرت بھی کرتا ھے۔ یہی وجہ ھے کہ اس کی تصنیفات پڑھنے کے بعد ھم میں ایک عجیب و غریب بد مزگی پیدا ھو جاتی ھے۔اس بدمزگی کو وہ گناھوں کا توڑ اور مصلح مانتا ھے۔لیکن کیا اس

طرح سے اس کی عجیب و غریب طبعیت کے تاریک رخ کو ٹٹولنا بعید از انصاف نہیں ہے؟ احسانمندی کے جذبات کے ساتھہ اس نور کی یاد ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے جو اس کے بیسیوں افسانوں اور ڈراموں میں صاف جھلکتا ہے۔اس کا خیالی ناٹک "Swanwhite"-اس کی کتاب "Kronbruden"اس کے تاریخی ناٹک- یہ سب اسی قسم کی تصنیفات ہیں—

---:o:---

مصائب و آلام میں پڑکر بھی وہ اپنی ناقابل تسخیر امید پر بھروسہ کرتا رہا-وہ برابر ہاتھہ پھیلا پھیلا کر "ابدی چھلاوہ"کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہا- انجام یہ ہوا کہ اسے خود اپنے شکوک میں بھی شک پیدا ہوگیا-ایذاے نفس اور مصائب کی دلدل میں ایک عرصہ تک ہاتھہ پاؤں مارنے کے بعد-آخرکار اسے ایک چٹان نظر آئی جہاں وہ بیٹھہ کر آرام لے سکتا تھا-عمر بھر تو اپنے ناٹکوں اور دوسری ذہنی کاوشوں کی مدد سے وہ خدا کو برا بھلا کہتا رہا-لیکن آخر کار جب اسے خدا ملا تو وہ ایک سہمے ہوئے بچہ کی طرح اس سے چمٹ گیا—

---:o:---

میں پہلے کسی موقع پر کہہ چکی ہوں کہ ہمارے تمام قومی شاعر اصل میں رومانی تھے-اب یہ سوال ہوسکتا ہے کہ"اسٹرن ڈن برگ تو پکا معقولی تھا اس کے متعلق یہ کہنا کس طرح صحیح ہے؟"میرا جواب یہ ہے کہ"اس کے باوجود بھی وہ رومانی ہی تھا"-کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں جس "واقعیت" (Realism) کا چرچا تھا وہ سواے اس کے کہ رومانیت کی ایک مسخ شدہ ہیئت ہو اور کیا کہی جاسکتی ہے؟ان نام نہاد واقعیت پرستوں نے وہی غلطی کی جو رومانی کر چکے تھے-فرق صرف اسقدر تھا کہ ان کی غلطی معکوس تھی-اگر رومانی اپنی تصویر میں فطرت کو"انسان اعلی"کا ایک شاندار اور روحانی میدان عمل بناتے تھے-تو اسٹرن ڈن برگ اور اس کے تابعین اسے ایک شرانگیز اور قابل نفرت جگہ خیال کرتے تھے جو نہ تو انسان کے رہنے کے قابل ہے اور نہ انسان اعلی کے-بلکہ"انسانی درندوں"کے لئے بنی ہے-یہ لوگ خیالی قصر تعمیر کرنے کی بجاے جیل خانے بناتے تھے-جذبہ کی بجاے ان لوگوں نے منطق واستدلال کو قوت محرکہ مانا-لیکن چونکہ محض منطق واستدلال ہی ہماری قسمتوں پر حاکم نہیں ہیں اس لئے جس نتیجہ پر یہ لوگ پہونچے وہ اتنا ہی"غیر واقعی"تھا جتنا کہ رومانیوں کا نتیجہ-اصل میں ان کی "طبیعیت"سواے"خشک رومانیت"کے اور کچھہ نہ تھی-جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے قائم کردہ تصورات یکے بعد دیگرے اپنی جگہ چھوڑتے چلے جارہے ہیں-تو بقول فلابرٹ کے-ان لوگوں نے یہ نیت کرلی

"کہ انسانیت کے خواب دیکھنے کی بجاے وہ انسانوں کا اسی نظر سے مطالعہ کریں گے جیسا کہ ہاتھیوں اور مگرمچھہ کا"—

———:o:———

اسٹرن ڈن برگ نے ان مسائل کا بہت کچھہ جامعیت کے ساتھہ بیان کیا ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں لوگوں کے ضمیروں میں کھٹک رہے تھے۔ لیکن سی۔ جے آلم کوسٹ غالباً ہمارا جدید ترین مصنف ہے۔ جدید سے میرا یہ مطلب نہیں کہ "جو کچھہ آج ہے" بلکہ "جو ہمیشہ رہے گا" پاؤں میں پر لگا کر وہ ہمیشہ اپنے ہم عصروں کے آگے آگے اڑا کیا۔ سینٹ سای من سے کہیں پہلے اس نے "اشتراکیت" اور عورتوں کے مساوی حقوق کے متعلق پیشین گوئی کی۔ ایک ایسے زمانے میں جب شادیاں خود غرضی پر مبنی تھیں۔ وہ ایسی مناکحت کے خواب دیکھتا رہا جس کی اخلاقی بنیاد سچی محبت پر رکھی گئی ہو! اپنے ایک جدید ترین افسانے میں اس نے اس نظریے سے عملی نتائج بھی مستنبط کئے ہیں اور ضمیر کا واسطہ دلا کر لوگوں سے قانون طلاق کی آسانیوں۔ قانونی اور آزادانہ شادیوں کی درخواست کی ہے۔ مہاتما گاندھی اور دوسرے مصلحوں کی طرح وہ حقیقت میں عملی سیاسیات کا مرد میدان نہ تھا۔ واقعات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس حد فاصل کو جو عملی زندگی اور تجریدی خیالات کے درمیان ہوتی ہے پار کر جائے۔ حقیقت میں وہ ایک فلسفی تھا اور اپنی خیالی فردوس میں بیٹھکر خواب دیکھتے رہنا اسے پسند تھا لیکن آخر میں وہ مجبور ہو گیا کہ کھلے میدانوں میں آئے اور چوراہوں پر کھڑے ہو کر اپنے مذہب کی تلقین کرے۔ جن عوام الناس کے روبرو اس نے اپنے اعلیٰ اخلاق کی تلقین کی وہ سطحی اخلاق اور "گندم نمائی جو فروشی" کے درس یافتہ تھے۔ جس دنیا میں اسے رہنا پڑا وہ ایسی تھی جو کسی بات میں اس کی ہمخیال نہ تھی۔ اس سے وہ کسی قدر خائف تھا اور کسی قدر متحیر بھی۔ لیکن اس نے ہمیشہ اس کا شاندار مقابلہ کیا۔ قسمت نے اسے ایسے ہم عصر دئے جو ہمیشہ اس کی طرف سے افسوسناک غلط فہمیوں میں مبتلا رہے اور ہمیشہ شد و مد سے اس کی برائیاں کرتے رہے۔ سویڈی پریس میں بے بنیاد غصہ و غضب کا جو طوفان آلم کوسٹ کے زمانے میں بپا تھا ویسا نہ کبھی اس سے پہلے تھا اور نہ اس کے بعد ہوا۔ مذہبی اور غیر مذہبی سب ہی جماعتوں نے اسے مطعون کیا "مخالف عیسائیت"۔ "بداخلاق"۔ "نوجوانوں کا گمراہ کرنے والا" یہ سب خطابات اسے دئے گئے۔ اگر کہیں وہ قرون وسطیٰ میں پیدا ہوا ہوتا تو شاید توہین مذہب کے الزام میں اسے زندہ ہی جلا دیا جاتا۔ اس وقت بھی اس پر جعل کا الزام لگایا گیا اور اسے ملک سے باہر کر دیا گیا۔

اگر واقعات رخ نہ بدلتے تو غالباً "Wildrose" کے مصنف کا یہیں ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جاتا!

---:o:---

جب میں اس کی جانب توجہ۔ سانولے رنگ کے متفکر چہرے پر غور کرتی ہوں جو اس کی فطرت کی طرح گوناگوں اور متضاد خط و خال رکھتا ہے تو مجھے اس کی قسمت پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ ایسے زمانہ میں کیوں پیدا کیا گیا جو اس سے اسقدر مختلف اور اس کے پیغام کو سمجھنے کے ناقابل تھا! وہ ہر اعتبار سے زندگی کا ایک گورکھ دھندا تھا جو اپنے اصلی زمانے سے ایک صدی قبل دنیا میں بھیجا گیا اور تنہا کوشش کرنا۔عجیب و غریب الہامی خواب دیکھنا۔ہزاروں کا مطعون بننا اور بدقت دو چار کی ہمدردی حاصل کرنا۔یہ باتیں اس کی قسمت میں لکھدی گئیں! *

یہ ہماری ہی صدی کے لوگوں کا حصہ تھا کہ وہ اس کی گرد و غبار سے اٹی ہوئی کتابوں کو فرسودہ الماریوں سے نکالیں اور انہیں حیرت و تعجب کے ساتھ پڑھیں۔ تعجب اس بات پر کہ آلمکوسٹ کو فن‌حیات اور عورتوں کے متعلق یہ انوکھے اور باغیانہ خیالات کہاں سے ملے؟ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے اکثر خیالات کی جڑیں اس نے اپنے وقت کی جرمن اور فرانسیسی ادبیات سے کھود نکالی ہوں لیکن جس طرز پر کہ اس نے ان خیالات کو نباھا ہے وہ اس کی اپنی ہے۔مثلاً سماجی برائیوں سے بحث کرتے وقت اس نے وکٹرھیوگو کی طرح کلفت کو اپنا نقطۂ نگاہ نہیں قرار دیا بلکہ اخلاقی ضرورت پر اس بحث کا مدار رکھا ہے —

آلمکوسٹ کی سب سے عجیب و غریب خصوصیت یہہ ہے کہ اگر ایک طرف اس کے استیپشاری۔نیم عامی معتقدات اسے مذہبی اور سماجی اصلاحات کی طرف لے جاتے ہیں اور انسان اعلیٰ اور جمہوریت کے نظریوں پر ختم ہوجاتے ہیں۔تو دوسری جانب وہ اصلی معنوں میں انفرادیت پسند نظر آتا ہے۔جس چیز نے پہلے پہل اس کے مداحوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا وہ اس کی یہی وسعت نظر اور اوپر۔ اندر۔باہر سب طرف دیکھنے کی عادت تھی۔اسی چیز نے ان لوگوں کو ترغیب دلائی کہ وہ اس مصنف کو اپنی ہی روحانی سطح پر جگہ دیں اور اس کی مطلق‌العنان ذھانت کو وقت کی دستبرد سے بچائیں۔ان ہی لوگوں نے اس کو نفرت۔

---

* شاید غالب نے اسی کی زبان سے کہا ہے —

با من میآویز اے پدر فرزند آذر را نگر * ہرکس کہ شد صاحب‌نظر دین بزرگاں خوش نکرد

مترجم

اور نیش زنی کے تیرہ و تار غار سے کھینچکر باھر نکالا-جھوٹے بہتانوں سے اس کے نام کو پاک صاف کیا-لگے ھاتھوں جعل کے الزام کو غلط ثابت کردکھایا-اور پھر اس کے سر پر ایک نیا اور چمکتا ھوا تاج رکھا-چنانچہ آج کل "بے دین آلم کوست" اپنا ایک خاص مرتبہ رکھتا ھے-اس کا ایک خاص "مذھب" بھی ھے اور اس کی تصنیفات ھمارے لئے معلومات و مسرت کا ایک بے پایاں ذخیرہ ثابت ھوتی ھیں-ھماری نظروں میں اسکی حیثیت-ایک پیغمبر-رشی اور نجات دھندہ کی سی ھے-پیغمبر اس اعتبار سے کہ وہ تن تنہا کھڑا ھوا اپنے زمانے کو گھرے سوالات سے جھنجوڑتا رھا اور مستقبل کا امید افزا نظارہ پیش کرتا رھا! رشی ان معنوں میں کہ اسے ذھن انسانی کی عجیب و غریب واقفیت حاصل تھی اور نجات دھندہ اس طرح کہ اس کا ظہور پرانے قوانین کو غارت کرنے کے لئے نہیں ھوا بلکہ غیر ضروری زوائد اور موانع کو دور کرنے اور اسے صاف کر کے نئے اور اعلیٰ مفہوم سے سرفراز کرنے کے لئے وہ اس دنیا میں بھیجا گیا—

اس نے یہہ کوشش کی ھے کہ اس دوی کے پردہ کو جو معمولی اور غیر معمولی-کافر اور عیسائی-جنت و دوزخ وغیرہ کے درمیان حائل ھے اٹھادے اور پہلے سے زیادہ برداشت اور ایک نئی اور روحانی وحدت حاصل کرے-اسی کوشش کے اعتبار سے اسے "جدید" کہاجاتا ھے—

وہ آزاد خیال ھونے کے ساتھہ ساتھہ پکا مذھبی بھی تھا اور سماجی اور سیاسی انقلاب پسند بھی-بقول ایلن کی کے "وہ کثرت میں رھکر وحدت کے خواب دیکھتا تھا" —

اس کو اس اعتبار سے بھی 'جدید' کہہ سکتے ھیں کہ ھمارے مزارعین کو ادبیات میں جگہ اسی نے دی-اب تک ان کا کام شعراء کی حاشیہ نشینی تھا-ان کا کام "مصرعہ اٹھانا" تھا-آلم کوست نے طبقۂ مزارعین سے نہیں بلکہ خاص خاص کسانوں سے بحث کی ھے-اس نے ان کی فلاکت وافلاس-ان کی آزادی و خود مختاری-ان کے اتقاء اور ان کی ذھانت کی تصویر کھینچی ھے اور ان کے مردانہ استقلال اور ھمت کے نقشے بتائے ھیں-ھماری سیاسی تاریخ میں کسانوں نے ھمیشہ نمایاں حصہ لیا ھے اور یہہ انہیں کی وطن پرستی اور عشق آزادی کا طفیل ھے جو ھم آج اور ھمیشہ "آزاد قوم" کہے گئے ھیں-جن لوگوں کو Scandinavia کا اچھی طرح تجربہ ھے وہ اس بات کی شہادت دینگے کہ ھمارے کسان تمام یورپ میں سب سے زیادہ جفاکش اور روشن خیال ھیں-ھمارے کالبد قومی میں ان کی حیثیت ھمیشہ مہرہ ھاے پشت کی سی رھی ھے اور یہہ شرف آلم کوست ھی کو حاصل ھوا ھے کہ اس نے سب سے پہلے ان کی زندگی کی سچی تصویریں ھمارے سامنے پیش کیں-

ایسی تصویریں جنہیں بجا طور پر کرشمہ زار مناظر کہا جاسکتا ھے —

—:o:-—

اس اعتبار سے بھی اسے جدید کہا جاسکتا ھے کہ وہ کسی قدر ھماری فطرت کے غیر شعوری جذبات کی علمی واقفیت رکھتا ھے۔وہ جانتا تھا کہ ذھانت و جنون اور جرم و الہام کے ڈانڈے ملے ھوئے ھیں-وہ پہلا سویڈی تھا جس نے اس حقیقت کو سمجھا کہ جرم اکثر صورتوں میں موروثی جبلتوں کا نتیجہ ھوا کرتا ھے اور اس نے جیل خانوں اور قوانین جرائم کی اصلاح پر زور دیا-جو چیز اسے اس قسم کے مرضیاتی (Pathologic al) تجربات کی طرف لے گئی وہ یہہ امید تھی کہ ھر روح میں کوئی نہ کوئی جزو خیر دریافت کیا جاسکتا ھے-اسے یقین تھا کہ اگر موجودہ نظام تعلیم کو زیادہ عقلی بنادیا جائے تو مجرمانہ رحجانات رفتہ رفتہ محو ھوجائیں گے اور قوانین جرائم کی ضرورت باقی نہ رھیگی-اس کا عقیدہ تھا کہ فطرت اپنی گہرائیوں میں خود اپنے نقائص کا علاج بھی چھپائے ھوئے ھے-اس حدتک وہ روسو کا ھم خیال ھے-لیکن اس کے آگے وہ نہیں بڑھا-روسو کے متعلق اس کا قول ھے کہ " وہ اپنے دل سے استدلال کرتا ھے اور دماغ سے روتا ھے "—

اپنے جمالیاتی (Aesthepic) عقائد کے اعتبار سے بھی اسے "جدید" کہا جاسکتا ھے-ان عقائد میں رومانی مذھب کے دعوون اور اس کی "علمی شجاعت" کا کثیر حصہ نظر آتا ھے-اس کا خیال ھے کہ سچے معنوں میں ماھر فن بننے کے لئے ضروری ھے کہ ھم دنیا کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور Don Quixote (خدائی فوجدار) کے ملازم کی طرح یہ جواب دیں " بیگم صاحبہ! میں ایسی ھی تصویر کھینچتا ھوں- اس لئے کہ ایسی ھی تصویر مجھے پسند ھے "—

—:o:—

جب ھم اس کے فلسفہ اور اس کے نتائج کا مطالعہ کرتے ھیں-اس کے ان جدید اور مائل بہ اکثریت خیالات کا جائزہ لیتے ھیں جن میں ایام گزشتہ کی آرازیں اب تک باقی ھیں اور اس کی ان نظموں کو پڑھتے ھیں جو ایک نادرۂ روزگار شخصیت کی بوباس میں بسی ھوئی اور اپنے حسن کے اعتبار سے سماوی معلوم ھوتی ھیں-تو بے ساختہ ھمارے ھونٹوں تک یہ سوال آتا ھے کہ "دنیا اس کے متعلق اتنی شدید غلط فہمی میں کیوں گرفتار ھوگئی؟ "اصطلاحی بحثوں سے ذرا دیر کے لئے قطع نظر کرلو-پھر بھی یہ سوال باقی رھتا ھے کہ کیا دنیا کو اس کے مردانہ نظریوں میں اس کی اصلی ذھانت کی جھلک نظر نہ آسکی؟ کیا اس کا بلند پایہ

یقین اور اپنی طرح دوسروں کی بھی مدد کرنے کا رفیع ارادہ لوگوں کو نظر نہ آسکا؟ اس کی نا تمام آرزؤں اور نا کام مسرتوں میں جو سوز و گداز پنہاں تھا دنیا نے اس کی کیوں قدر نہ کی؟ اگرچہ اس کی زندگی پیچیدگی اور تضاد کا ایک گورکھ دھندا ہے- پھر بھی اس کے مزاج پر غور کرو تو اس میں تم کو عجیب و غریب اور مسلسل وحدت اور یکسانیت نظر آئے گی-اس کی زندگی کو متفرق ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لئے یہی آخری خصوصیت کافی تھی اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ظاہری اشکال کے پردہ میں سے جوہر کو حاصل کر لیا جائے اور یہی اس کی "جدت" ہے- جس چیز کی وہ "تخریب" کرتا تھا اسی کی وہ دوبارہ اخلاقی بنیاد پر "تعمیر" کر دکھانے کا دعوی کرتا تھا-لیکن چونکہ بد قسمتی سے جس "دوی" کے خلاف کہ وہ جد وجہد کرتا رہتا تھا-خود اسی کا شکار تھا-اس لئے اکثر صورتوں میں اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی-اس کے ذہنی اور جسمانی قواء کی جس زمانے میں تکمیل ہوئی وہ آزادی اور حریت کا زمانہ تھا لیکن ایسی آزادی اور حریت جو ماضی کے موانعات پر غالب آنے کی تو کوشش کرتی ہے مگر سیاسی اور سماجی موانعات سے گھبراتی ہے! "شرافت خاندانی" کے بدلے خوشحال اور نمائش پسند سماج میں "سیم و زر" کی پرسش ہوتی تھی اور آلم کوست اور اس کے اصلاحی تصورات کے ساتھہ جو ظالمانہ برتاو روا رکھا گیا اس کا زیادہ تر یہی سبب ہوا—

---:o:---

آلم کوست کی دو حیثیتیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ تھیں-ایک تو وہ آلم کوست تھا جو معاشری مصلح تھا-لیکن دوسرا آلم کوست وہ تھا جو اپنی خیالی بہشت میں آرام کے ساتھہ بیٹھا ہوا دنیا کو فراموش کر چکا تھا اور توصیف اور تفضیح دونوں سے قطعاً بے نیاز ہو کر "خالص محبت" کی پاک اور بے لوث زندگی بسر کرتا تھا-ایسی زندگی جو "حال" پر قانع رہتی ہے اور فضول ادھیڑ بن میں نہیں پڑتی-یہ اس کی فلسفیانہ حدود تھیں جو مصنوعی نہ تھیں بلکہ خود ساختہ اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں سے نکلی تھیں-یہ ہی محبت کا فلسفہ اس کی کتاب "Book of the Wildrose"- "جنگلی گلاب کی داستان" کی روح رواں ہے- اس کتاب کا منشاء یہ تھا "کہ کائنات کا عکس لیا جائے"-اس کتاب کی علامت ایک جنگلی گلاب کی تصویر تھی اور اس کے نیچے یہ عبارت درج تھی "خوشرو ہمجنسوں کی سبھا"-آلم کوست اپنے تصوفانہ انداز میں دنیا کو ایک گلاب کا پھول اور مشقت-حسن-یقین اور دوسری دنیاوی جد و جہد کو پنکھڑیاں سمجھتا تھا- مذکورۂ بالا عبارت میں اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے-یہ کتاب ہماری سویڈی

"هزار داستان" ہے اور اس میں ادبیات کی جملہ اصناف مثلاً افسانہ۔نظمیں۔ڈرامے۔مضامین۔رزمیہ۔دھقانی شاعری کے نمونے۔حتیٰ کہ راگوں کے نمونے بھی شامل ہیں—

———:o:———

وہ کہتا ہے:—

"میں انسانی جماعتوں سے دور دور بھاگتا رہا میں نے اپنے تخیل میں اپنی دنیا علیحدہ پیدا کی۔اس دنیا میں مجھے زیادہ لطف اس وجہ سے آتا تھا کہ میں اس کے رہنے والوں سے بلا خوف اور بغیر کوشش روابط پیدا کر سکتا تھا۔یہ ھمیشہ میرے اشاروں پر چلتی تھی اور جیسا کچھ میں بتانا چاھتا تھا بن جاتی تھی"—

———:o:———

اسٹرن‌ڈن برگ کی طرح اس نے بھی "بچپن ھی سے خدا کی تلاش کی" لیکن جہاں اسٹرن‌ڈن برگ کو صرف شیطان ملا۔آلم‌کوست "عشق" سے دو چار ھوا اور یہی عشق اس کے فلسفہ کا تصوفانہ جوھر ہے—

"عشق ایک راز ہے اور اس کی ابتدا اور
اس کے اثرات دونوں پر اسرار ھیں
عشق کی جسارت کرنا اور مرنے سے واقف
ھونا دونوں ایک ھی بات ھیں
سب سے بڑی آزمائش جو کسی شخص کی
ھو سکتی ہے یہ ہے کہ اس سے عشق پیدا کرو
عشق ھماری ھستی کا جوھر اصلی ہے اور بغیر کسی
تامل کے ھمیں اس جبلت کی پیروی کرنا چاھئے"

———:o:———

اسٹرن‌ڈن برگ کے فلسفہ کا آلم‌کوست پر گہرا اثر پڑا اور اس نے اکثر اسے نظم بھی کیا ہے مثلاً Murnis (مرنس) یا "قصص رفتگاں"۔"Tales of the dead" دونوں عشق کو یقین کی جان سمجھتے تھے لیکن آلم‌کوست اس سے بھی آگے بڑھ گیا ہے وہ کہتا ہے "عشق روح کی جان ہے اور عشق ھی خدا ہے" کائنات کا ساز ہم آھنگ ہے۔

جتنی بھی چیزیں اسے نظر آتی ھیں ان سب میں ''ابدیت'' کی جھلک ھے اور یہ فی الحقیقت عشق کی جھلک ھے اس کا مقصد یہ ھے کہ ارض و سما کو ملا دیا جائے قلب انسانی میں حسن و مذھب کو ضم کر دیا جائے اور خود مذھب میں کسی قدر عجائبات پرستی کی شان پیدا کر دی جائے-اس کا خیال ھے کہ عیسائیت کو سرور و انبساط کا مذھب ھونا چاھئے-''انبساط و سرور غم و اندوہ سے قدیم تر ھیں-اس لئے کہ بہشت کا وجود ھبوط آدم سے پہلے بھی تھا'' اس نے ایک مذھبی ناٹک ''مریم'' لکھا ھے-اس میں وہ کہتا ھے:—

''بچے ایک دوسرے سے عشق رکھتے ھیں! بہت کم لوگ ایسے ھیں جو عشق سے نا آشنا رھکر اس راز کو سمجھ سکیں-وہ ھمیشہ علامتوں-خیالوں اور جملوں میں مدد و استعانت کے جویا رھتے ھیں اور باوجودیکہ وہ بغیر مدد و استعانت کے رھتے ھیں پھر بھی یہی کہتے ھیں کہ ھماری مدد کی گئی-خداوندا! تیرا دن ڈھل گیا ھے لیکن یہ دوبارہ طلوع ھوگا''—

رومانیوں کی نظر میں حسن و عشق خیالی اور مثالی چیزیں تھیں لیکن آلمکوست چاھتا تھا کہ ان کو ھماری زندگیوں میں داخل کر دے-شاعری کو وہ ایسا پل سمجھتا تھا جو اس دنیا کو اس دوسری دنیاے حسن کے ساتھ ملا دیگا-'' جو شعرا اتنی گریہ و زاری کرتے ھیں انھیں چاھئے کہ اپنے رومال دھو ڈالیں اور ان سے بنی نوع انسان کے آنسو پونچھیں''—

—:0:—

نوجوانوں سے آلمکوست اس لئے محبت کرتا تھا کہ یہ لوگ ھمیشہ جوھر کی تاک میں رھتے ھیں—

''شباب ھی دنیا کو آگے بڑھاتا ھے-یہ میرا رفیق ھے-اس لئے کہ یہ روح کی حمایت کرتا ھے''—

اور نوجوانوں کو بھی اس سے الفت ھے-اس لئے کہ وہ اپنے خیالات-افعال اور خوابوں میں ''نوجوان'' ھے-انھی کی طرح جلد باز-ویسا ھی شریف-ویسا ھی پیش دست! وہ انھی کی طرح سیانا-وجدان پرست اور آزادی کا دیوانہ ھے-سب سے بڑی بات یہ کہ وہ سرتاپا سویڈی ھے اور اپنی قوم کی طرح الہامی لمحات میں روح کی معمولی افادی سطح سے بلند ھوکر تصوف کی معراج حاصل کر لیتا ھے —

—:0:—

شعرا کی ان جگمگاتی ھوئی صفوں سے گزر کر جب ھم خاتمہ پر پہونچتے ھیں

تو ہم کو عجیب بے ترتیبی نظر آتی ہے-اس مقام پر پہونچ کر ادبی مذاہب کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا-واقعیت اور رومانیت کے پے درپے منازل طے کرکے اب ہم اپنے آپ کو اس جگہ پاتے ہیں جہاں یہ نام ایسے ہی دوسرے ناموں سے مخلوط ہوکر رہ گئے ہیں-قدیم بسیط اور سادہ جبلتوں کی جگہ ہمیں ایسی ذہانت سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس کی پیچیدگیاں روز افزوں ہیں-قدیم فطری روانی کی جگہ ہم کو آورد اور معرکات نظر آتے ہیں-شاعری کے منابع اور عناصر میں آج ہمیں وہ اگلا سا اچھوتا پن نظر نہیں آتا-آج کل ''ادب'' سے مراد نئے اور نا معلوم میدانوں میں موشگافیاں کرنا نہیں ہے یہ سب کچھ ہے لیکن ''عجوبہ پسندی'' کا وہی شوق آج بھی باقی ہے-روح انسانی کے تاریک ترین مقامات تک ہم درانہ بڑھتے چلے جارہے ہیں لیکن جس درخت کے پھول پھل انیسویں صدی کی ادبیات کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے اور جو درحقیقت ہماری نشاۃ ثانیہ تھی اسی درخت کے تنوں میں آج کل آب زندگی خشک ہوتا چلا جارہا ہے—

''وہ سب چلے گئے-بالکل چلے گئے-آج مغرور شخصیتیں
پہلو بہ پہلو آرام کرسکتی ہیں-اگرچہ ہم کو گانے
کا اذن مل چکا ہے-لیکن خبردار! کوئی نغمہ بلند
نہ ہو- وہ تو جاچکے! اب ان کے عشق و محبت
کے پنہاں دشت وجبل میں صرف
آہستہ بولنا ہی کافی ہوگا!!''

———:0:———

بے شک! وہ عشق ورومانیت کے مطرب اب چلے گئے ہیں-ان کو عشق سے عشق تھا-حیات انسانی کے متعلق ان کی بصیرت ملہمانہ تھی-وہ قوس قزح کے زریں کناروں کو زر کی تلاش میں کھودتے تھے اور خوش رہتے تھے-جس ترتیب میں وہ آتے اور رخصت ہوتے گئے ہم اسے نام بنام بتا چکے ہیں-ہاں نام بتا کر اور اپنے کم فہمانہ کتبہ ہائے مزار پڑھ کر ہم انہیں بدنام کرچکے ہیں-ان کے نغموں کی گونج ابھی تک ہمارے کانوں میں باقی ہے-ان کے نور کی ہلکی ہلکی جھلک ابھی تک ہمارے گردوپیش باقی ہے اور ہم مفلس رشتہ داروں کی طرح ترکہ کے لئے دست و گریباں ہورہے ہیں! ان کی سوانح اور ان کے طرز عمل کے متعلق جتنے متنازع فیہ مسائل تھے ختم ہوچکے ہیں-اس لئے کہ ہم ہر چیز کی تعئین کرچکے ہیں یا کم از کم ایسا خیال کرتے ہیں-ہم وضاحت کے ساتھ بتلا سکتے ہیں کہ کگنڈر کی ذہانت کا چراغ کب گل ہوا اور وہ کب پاگل ہوا-ہم نے یہ بھی تحقیق سے معلوم

کر لیا ھے کہ آلم کوسٹ دغاباز اور سارق نہ تھا-یہہ تو ھے-لیکن ان کی شاعری !! طویل اور پر از نتائج مباحثہ کے لئے ھمارے پاس کیسا اچھا مواد موجود ھے! میرا یہہ منشاء نہیں ھے کہ ھم صرف بعض جرمنوں کی طرح "سوسن کی تصویر کھینچیں اور ایک قدیم فن کو فروغ دیں"-لیکن یہہ حقیقت ھے کہ ھم آنکھیں بند کر کے کسی حصۂ نظم و نثر سے لطف اندوز ہونا نہیں جانتے-ھم کو تو اصلی لطف جب ھی آتا ھے جب ھم انگلی ڈال کر کسی نازک خیال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ھیں-یا جب کسی نظریے کی تغلیط میں کامیاب ہو جاتے ھیں! ھم کو تو یہہ ثابت کرنے میں لطف آتا ھے کہ ایکسل لوندے گارڈ * دراصل وکٹوریہ بینی ڈیٹسن تھا اور یہہ کہ موخرالذکر نے اول الذکر کے عشق میں جان دی اور اپنی موت سے نہیں مری-اس کا کیا سبب ھے ؟ کیا ھم میں اس نظر کی کمی ھے جس کی مدد سے ھم اپنی چیزوں کو انصاف کے ساتھہ جانچیں یا پھر کیا ھم اتنے جدید ہو گئے ھیں کہ فن موسیقی کو کھو بیٹھے ھیں-وہ فن جو اسی وجہ سے ھے کہ "پرففی" سے خالی اور سادہ ھے ؟ کیا ھم اتنے منزہ اتنے چھان بین کرنے والے اور اس قدر پر متانت ھیں کہ پرندوں کی طرح سادگی سے گانا عجیب سمجھتے ھیں ؟ یا پھر کیا ھم کسی ایسی "نساۃ" کے قریب ھیں جو پہلی کے مقابلہ میں زیادہ شاندار ہوگی-جیسی کہ آئر لینڈ کو یٹس (Yeats) میں نصیب ہوئی ! کیا شلر (Schiller) کا خواب کبھی ھمارے لئے اصلیت بن کر ظاھر ھوگا اور ھم ایسی بہشت میں داخل ھوجائینگے جہاں فاتح کی حیثیت سے ھم کو ھم آھنگی اور سکون بطور انعام کے حاصل ھوں گے-ایسی بہشت جہاں جبلت اور قانون کی جنگ ختم ھو جائیگی حسن کی حکومت ھوگی-دنیاوی قیدو بند سے آزاد ھوکر صداقت مطلق العنان ہوگی! جہاں سچے "واقعیت پسند" سچے مثالیت پسندوں (Idealists) سے مل جائیں گے اور دلوں کو کسی نئی جنگ کا سامنا کرنا نہ ہوگا-ایسی بہشت جہاں کا بلند ترین نغمہ "سکون" ہوگا-وہ سکون نہیں جو جبریہ صبر اور جمود کا مرادف ھے-بلکہ وہ سکون جو کمال سے پیدا ھوتا ھے اور قوت اور طاقت کا سرچشمہ بن جاتا ھے !

---:0:---

---

* یہ تلمیحات سویڈی ادب سے متعلق ھیں-اس کا ملشا یہ ھے کہ تجسس علمی کے شوق میں ھم اس ادب کے حسن سے بے خبر رہ جاتے ھین-اردو ادبیات مین اس کی بہترین مثال وہ مختلف طویل مقدمے ھین جو غالب نظیر وغیرہ کے کلام پر لکھے گئے ھین اور جن میں علمیت کا ذوق خالص جمال پسندی کے رجحان پر غالب آگیا ھے — مترجم

وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے

از

(جناب محمد عظمت اللہ خان صاحب بی-اے)

کوئی شے بھلی بری نہیں ھے کوئی بات یاں اٹل نہیں ھے
ھے یہ زندگی عجب پہیلی کوئی اس کا یاں تو حل نہیں ھے
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

کسی گود مامتا بھری کی میں بھی چین اور سکھ کبھی تھی
کسی آنکھ کی تھی میں بھی پتلی میں بھی نازوں میں کبھی پلی تھی
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

ابھی کچھ ھوئی نہ تھی سیانی کہ اٹھا بڑوں کا سر سے سایا
تو زمانہ نے یہ پلٹا کھایا کہ کسی کو پھر نہ اپنا پایا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

نہ خبر زرا بھی لی کسی نے پڑے اپنے جان کے ھی لالے
مرے سامنے کھڑے تھے فاقے پڑی کیا غرض کسی کو پالے
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

یہ کٹر دلوں کی طوطہ چشمی مرے من میں تیر سی ھی بیٹھی
گئی من کے پھول کی تراوت اڑی اوس کی طرح سے نیکی
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

نہ رھا کسی پہ کچھہ بھروسہ نہ رھا کوئی مرا سہارا
نہ رھی کسی کی میں ھی پیاری نہ رھا کوئی مرا ھی پیارا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

تھیں وھیں پڑوس میں طوائف تھا بڑا ھی نامی ان کا ڈیرا
مرے سر پہ ھاتھہ انہوں نے رکھا مجھے پیار سے سبھوں نے گھیرا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

کھلی سامنے نئی ھی دنیا نظر آئے سب نئے وتیرے
نئی گفتگو نئے طریقے نئی جستجو نئے وسیلے
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

مجھے چاؤ چونچلوں سے پالا مری تربیت کا ڈول ڈالا
مجھے گانا ناچنا سکھایا مرے من کو تن بدن کو ڈھالا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

کھلی آدمی کی ساری قلعی مجھے زندگی کا گر سکھایا
مجھے اصلیت سے جا بھڑایا مجھے گویا خواب سے جگایا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے

غرض اس طرح کی پا کے سکھشا نظر آئی زیست ایک میلا
هیں جہاں جوئے کی سب دکانیں وهی هار جیت کا جهمیلا
وه هوں پهول جس کا پهل نہیں هے وه هوں آج جس کی کل نہیں هے

تهی حسینوں میں مری نه گنتی نه تو حور تهی نه میں پری تهی
مرا رنگ سانولا سلونا مری نین بجلیاں بهری تهی
وه هوں پهول جس کا پهل نہیں هے وه هوں آج جس کی کل نہیں هے

مرے بال کالے لانبے لانبے که اتها هو جیسے ابر کالا
مرا سینه بهی امڈتا بادل بهری بجلیوں سے تهرتهراتا
وه هوں پهول جس کا پهل نہیں هے وه هوں آج جس کی کل نہیں هے

مری بات چیت ایسی دلکش که هر ایک بول دل میں اترے
مری سحر تهی لطیفه سنجی مرے فقرے چست صاف ستهرے
وه هوں پهول جس کا پهل نہیں هے وه هوں آج جس کی کل نہیں هے

رهی دل لگی مری بہت سے نه مگر کسی سے دل لگایا
رکهی هر طرح سے تندرستی یوں جہان کا مزا اڑایا
وه هوں پهول جس کا پهل نہیں هے وه هوں آج جس کی کل نہیں هے

مرے عاشقوں کی تهی نه گنتی مرا فن میں تها بلند پایا
مرے گرد هن برس رها تها میں دهنی هوئی وه دهن کمایا
وه هوں پهول جس کا پهل نہیں هے وه هوں آج جس کی کل نہیں هے

جو ہیں نیک آپ کو سمجھتے مجھے بیسوا پکارتے ہیں
وہ مگر ہیں اصلیت سے کورے نری باتیں ہی بگھارتے ہیں
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

میں بنی تھی عشق عاشقی کو کہ ہے استری کی یہ بھی فطرت
کوئی یاں اٹھائے بال بچے تو کوئی اڑائے عیش و عشرت
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

ہو نکاح یا کہ آشنائی کسی رنگ سے ہے پیٹ بھرنا
کہیں عیش اور عشق بازی کہیں ایک ہی خصم کا بھرنا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

مجھے ایک تیتری سمجھئے مرا کام پھول پھول اڑنا
کہیں رس کے واسطے ٹھٹکنا کہیں پنکھڑی پہ جھول اڑنا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

مری زندگی بڑا سبق ہے کہ یہاں کی خوب سیر کی ہے
ہے مزے کی چیز پر یہ دنیا نہ تو شر کی ہے نہ خیر کی ہے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

جسے دیکھو اپنے داؤ میں ہے چلا داؤ اور وہ پچھاڑا
کہ یہ زندگی ہے ایک کشتی یہ جہان اک بڑا اکھاڑا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

نہیں اس جگہ کوئی کسی کا کہ ہے آدمی غرض کا بندا
یہ سدا سے ہی یہاں کا دھندا یونہیں بس رہا رہیگا گندا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

جاپان کی بعض ہمعصر شاعرات

مترجمۂ مولوی سید ہاشمی صاحب

[ذیل کا فاضلانہ مضمون پروفیسر ای ای اسپیٹ کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور دو سال ہوے جاپان کے ایک انگریزی اخبار میں چھپا تھا۔ پروفیسر اسپیٹ انگریزی زبان کے بہت اچھے ادیب اور ایک ممتاز شاعر ہیں اور سالہاے دراز تک جاپان میں رہنے کے بعد حال میں حیدر آباد آے ہیں اور درحقیقت یہ نظام کالج اور جامعہ عثمانیہ کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں انگریزی کی تعلیم کے لئے ایسا فاضل استاد ملا۔ ہم صاحب موصوف کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس مضمون کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی خوشی سے اجازت دی اور امید کرتے ہیں کہ آیندہ بھی پروفیسر اسپیٹ اور ان کی انگریزی شاعری کے متعلق رسالۂ اردو میں کوئی مفصل مضمون لکھنے کا موقع نکالیں گے۔ اڈیٹر]

" سیجاکو وا
ایہازو توتوکی
امت سوچی نی
کوے ناکو سوکی نو
وارتو اری تاوا "

(اسوقت کا سناٹا کتنا قیمتی ہے۔ زمین و آسمان صدا سے خالی ہیں اور میں چاند کے ساتھہ تنہا ہوں !)

(از بیگم کو جو)

کارل بسے کا قول ہے کہ ہر قوم کا علم ادب اسی قدر ہے جتنی کہ وہ اہلیت رکھتی ہے۔ لیکن ایسا پردیسی جسے جاپانی علم ادب کے ساتھہ اتنی واقفیت ہو کہ وہ

اس معیار کے مطابق جاپانی قوم کی قابلیت کا صحیح اندازہ کرسکے ہنوز منصۂ شہود پر نہیں آیا ہے۔اور حق یہہ ہے کہ اس اعجاز نمائی کے لئے سالہا سال کی محنت فطری مناسبت اور وہ شوق صادق درکار ہے کہ آدمی حصول مراد کی امید میں اسی کام کا ہو رہے۔ہمارے اور جاپانیوں کے افکار میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ ہمارے اور ان کے افکار کے درمیان غیر تحریر۔غیر زبان اور غیر استعارہ کے تاریک حجاب حائل ہیں اور ان کی ایک قدیم نظم کا صحیح مفہوم لفظی ترجمہ کے ذریعہ سے سمجھانا اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے جتنا کہ لوگ بے پروائی سے خیال کرلیتے ہیں۔جاپانی شعر کا مفہوم سمجھنا دریا کی ایسی گہرائیوں میں اترنا ہے جن کا سطح پر سے بہت کم لوگ اندازہ کر سکتے ہیں۔وہ زمان و مکان دونوں سے جن میں ہم الجھے ہوے ہیں ماوری ہے۔چنانچہ جاپانیوں نے اپنے اشعار کو اس قسم کے ناموں سے موسوم کیا ہے جیسے "حال جاودانی" اور مثال کے طور پر جن قلبی کیفیات کا مندرجہ عنوان ابیات سے اظہار کیا گیا ہے۔وہ اگر ہے تو کچھہ اس موسیقی سےمشابہ ہے جس کا نغمۂ ناشنیدہ ہند کے قدیم جوگیوں کو یاد دلا دیتا تھا کہ اس گیان دھیان کا وقت آگیا جوصرت سکوت وعبادت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور جس کی یادگار کبھی اگر رہی تو صرت کاملؔ گیت کی صورت میں محفوظ رہی:—

"اوراکانی
اوئیرا مکیت
کھوری ہیکو
واگا ہارو نو ہی نو
جی نو کورو کانا"

(میری بہار کے دن جب بخوردان سے عود کا دھواں چکر کھاتا ہوا اوپر چڑھتا ہے۔اسوقت میرا حجرہ ایک بڑے مندر کے مثل اور میرا دل ساکن و مطمئن ہے)
(مسز اکیکو یوسانو)

———:o:———

مجھہ سے ایک مرتبہ رابندرانا تھہ ٹیگور نے نرم اور دردمندانہ الفاظ میں بیان کیا کہ جاپانی شاعری کے اس طرح چشم عالم سے مستور ہوجانے کا انہیں کس قدر قلق ہے۔ان کے نزدیک اس شاعری میں جس کی تہ کا مطلب اتنی دشواری سے ہاتھہ آتا ہے ضرور کوئی نادرو نایاب شے پنہاں ہوگی۔مغربی شاعری کے متعلق وہ اور میں اس بات پر متفق تھے کہ قریب الفہم ہونے کے باوجود اس شاعری مین بار بار ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو اصل مفہوم کو عقدۂ سربستہ بنا کر چھپا

لیتے ھیں-مگر خود ٹیگور کے پردۂ باطن کا راگ تو اس دم ساحری کا منتظر اور اس نغمے کا مشتاق تھا جس کی تال اس کی اپنی حرکت قلب کے ساتھ ھم آھنگ ھو-شاید اس کی دلی کیفیات اس نابینا کے جذبات سے مشابہ تھیں جنکی مسز ھو ھر کو کتا یاما نے تصویر اتاری ھے:—

کوجو مشی ای
نہی کو نو ھستو دو
ماچی وابی نو
کازےوا نیشی فکی کامتا می ناسی فوکو"

(مغرب کی طرف اور جنوب کی طرف ھوائیں تیز چل رھی ھیں-مگر یہ اندھا بہت دیر سے دست رھنما کے انتظار میں ھے!)

مجھے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ جاپان کی ھم عصر شاعرات کے اشعار میں ھمیں اس صدا کا جواب ملتا ھے جو رابندرا ناتھہ کے علاوہ اور بھی بہت سے اھل فکر بلند کرنے پر مجبور ھوئے ھیں-یہ لکھتے وقت میرا اشارہ بالخصوص اس صنف اشعار کی طرف ھے جسے اوتا یا تانکا کہتے ھیں-ورنہ ھوکو کو میں اتنا باوقعت نہیں سمجھتا اور اس کا سبب یہ نہیں کہ ان چھوٹے ظروف میں بڑے خیالات سما نہیں سکتے-بلکہ دراصل جاپانی زبان میں صرف سترہ رکن کی نظم کو کسی مربوط بحر میں لانا ممکن نہیں ھے-اور شاعری کے تمام عناصر ھیں-میں بحر کے پرکیف وجدانی اثر ھی کو سب سے زیادہ ضروری شے سمجھتا ھوں-خود ھماری زبان میں ھوکو کی کئی مثالیں موجود ھیں جو سب سے الگ تھلگ ھونے کے باوجود کمال شاعری کا نمونہ ھیں-چنانچہ یہ کسی جاپانی استاد کا نہیں بلکہ رچرڈ جیفریز کا شعر ھے:—

"When the crescent of the new moon shone,
All the old thoughts were renewed."

———:o:———

مگر ھمیں اس مختصر مضمون میں ھوکو کی طرح جاپان کی بلاوزن نظموں کو بھی اپنے تبصرے سے خارج رکھنا مناسب ھوگا-جاپانی زبان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تقلید میں اس قسم کی بہت سی نظمیں کہی گئی ھیں-لیکن جاپانی ادب میں شاعری کی یہ صنف ابھی تک وہ درجہ نہیں پاسکی جو انگریزی یا فرانسیسی میں اسے حاصل ھے-اپنی زبان کی ساخت کی وجہ سے جاپانی شعرا کو وھی مجبوریاں پیش آرھی ھیں-جو ایک روز گویٹی اور ھاکنے کو پیش آئی تھیں-اگرچہ ان کی لسانی مشکلات کے اسباب دوسرے تھے مگر اتنا غنیمت ھے کہ ان کی زبان

ایسی پرشوکت اور جہیرالصوت بھی نہیں ہے جیسی ہسپانیہ والوں کی جس میں ادنی سی ادنی بات کہنے میں تکلیف وطمطراق پیدا ہو جائے۔اصل یہ ہے کہ بلا وزن نظم میں زیادہ تر عام زبان استعمال کی جاتی ہے اور جاپانی روز مرہ میں کثیر الفاظ ایسے داخل ہیں-کہ اصل چینی ہیں وہ کیسے ہی پر لطف کیوں نہوں-جاپانی میں بے زور ہوکر محض پرانا سکہ رہ گئے ہیں-بایں ہمہ اصلی اوتا ابھی تک حوادات روزگار سے محفوظ ہے اور روش اساتذہ یہی ہے کہ اوتا میں قدیم الفاظ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ زیادہ کیا جائے اور ان الفاظ میں اصوات و کنایات کا وہ نادر حسن پایا جاتا ہے جنکی نظیر اگر ملے گی تو یونانی زبان کے لطیف ترین اشعار میں ملے گی-لیکن جس طرح یونانی نظم کے بعض بہترین قطعات سافو سے لے کر زوناس تک) ایک ہی رکن کی تکرار سے بد صورت ہوگئے ہیں اسی طرح بعض جاپانی ابیات میں صوت و معنی کی باہمی مناسبت مفقود ہے اور ان کے اعلیٰ تخیلات کی جیسی داد غیر زبان کے ترجمے میں دی جاسکتی ہے اصل زبان مین نہیں دی جاسکتی-اس کی مثال مسز اکیکو یوسانو کی یہ نظمیں ہین:—

"شیرانامی نو
نونونی سوگاریتی
ارای سو نو
اکی نو ہاجیم نو
تشوکی نوبوری کی نو"

(ساحل صحرائی پر خزاں کا پہلا چاند طلوع ہوا کہ امواج سفید کی عبا سے لپٹا جاتا تھا)

"نات سوگومو نو
کزد ریت اوچی شی
شیرو نو کیشی
ہی نو کتا ہاشی نو
کوری نائی نو کشی"

(کوکنار کے سفید پھول موسم گرما کے شکستہ واوفتادہ بادلوں اور سرخ پارہ ہائے آفتاب کے مانند معلوم ہوتے ہیں)

مذکورۂ بالا ہردو تانکوں میں بعض حروف علت کی تکرار ہم کو اپنے علم ادب کی اسی قسم کی امثلہ کویاد دلاتی ہے مثلاً تنی سن کہتا ہے—

" Passed up the rich city to his kin "

لیکن جاپانیوں کے نزدیک " نو " اور " شی " کے ارکان کی تکرار ناگوار

نہیں گزرتی اور بہت ممکن ہے کہ اس سے ان کا دماغ کسی گت کری یا دوسری لے کی طرف منتقل ہو جاتا ہو اور اصلی نغمے میں یہ ننھی ننھی گھنٹیاں تنوع کا لطف پیدا کرتی ہوں اور انہیں رواج قدیم نے اسی غرض سے جائز قرار دیا ہو—

———:o:———

تانکا جیسی صنف کی کوتاہیاں ظاہر ہیں-اس کے دائرے کو بند کے درجے تک کبھی وسعت نہیں دیگئی-اس لئے ہم اس کو کسی ایسی صنف نظم میں داخل نہیں کر سکتے جو موسیوپال کلاڈیل کے الفاظ میں "خیالات و تمثلات کے زبردست دھارے" کی شان رکھتی ہے-اسی کے ساتھ تانکا شاعری کی محض اس حرک کا نتیجہ نہیں ہے جسے اسی فرانسیسی مصنف نے پو اور بودیر کے کلام کی تنقید کرتے وقت "اعصاب دماغ کی چھیڑ" سے تمثیل دی ہے—

دراصل دنیا کے بڑے بڑے شعرا نے اسی طرح تانکے کی مثل چھوٹے چھوٹے قطعات میں) پھول بکھیرے ہیں اگرچہ ان میں سے بہت سے خشک پتیوں میں چھپے ہوئے ہیں-سیفو کی شاعری کے جس قدر دل آویز ٹکڑے باقی رہ گئے ہیں وہ جاپانی نظموں کی طرح مختصر ہیں اور شاید نظم کا جس قدر حصہ ہمیں یاد ہو وہ ایسے ہی چمکدار و نظرافروز خزانوں پر مشتمل ہو جیسا کہ بہترین تانکا ہوتا ہے- انگریزی نظم کے مندرجۂ ذیل اشعار طول کے اعتبار سے قریب قریب تانکا کے مساوی ہیں—

" There is in God some say
A deep but dazzling darkness as men here
Say it is late and dusky because they
See not all clear."

(از ہنری واگہن)

" At my back I always hear
Times winged chariot hurrying on
And yonder before us lie
Deserts of vast eternity."

(از اندر یوماروپل)

" My brother prays so saith Kabir
To brass and stone in heathen wise
But in my brother's prayers I hear

My own unanswered agonies."

———:o:———

میں جب نظموں کے اس انتخاب پر نظر ڈالتا ہوں جو عصر حاضر کی لا تعداد شاعرات میں سے چند کی تصانیف سے کیا گیا ہے تو یہ مجھے ایک خوبصورت لڑی معلوم ہوتا ہے جس کے موتی گہرے رنگ کے چمکدار اور شوخ ہونے کے ساتھہ متانت بھی رکھتے ہیں اور موسم خزاں کے چاند کی طرح صاف و شفاف یا قدیم جنگل کی طرح پر اسرار ہیں —

تسوبا کی طرح اوتا کے محدود دائرے میں بھی جاپان کی اختراعی قابلیت ان سب چیزوں کو محفوظ رکھتی ہے جن کو یہ عزیز یا محترم جانتی ہے یا جن سے خوف کرتی ہے۔اگرچہ تسوبا بہت متین صنف کلام ہے اور اس میں خاص طور پر خشیت و تقویٰ کا رنگ ہوتا ہے۔تاہم اوتا میں بچپن اور جوانی کی خوشیاں اور عہد مادری کی تنہا گھڑیاں آرزوئیں اور ارمان نہایت آزادی کے ساتھہ بیان کئے گئے ہیں:—

" نن گیو نی
کوئی وو یوروشی نو
تاراچینی وا
اتے کے ناکی ھی نو
چی ساکی کینا نی "

(بچپن کے دنوں مین میرے چھوٹے ہاتھوں میں گڑیاں ہوتی تھیں۔میں ان کو پیار کرتی اور میرے ماں باپ اس دلدادگی کو جائز رکھتے تھے)

" میوسا شینو نو——الخ "

(لڑکپن کے زمانہ میں میوسا شینو کے پیڑوں میں اپنی والدہ کے برابر کھڑے ہوکر میں ڈوبتے سورج سے دعائیں مانگا کرتی تھی)

" آو آو تو
تسوکی سے شی۔اریبا
ھاھا توکو گا
ڈوموشیبی مو سیڈی
نیشی موری نوای "

(چاند کی سبز شعاعیں جب ہمارے بیابانی گھر کے اندر آتیں تو اس وقت میں اور والدہ بغیر چراغ جلائے سو جایا کرتے تھے)

(از مسز مت سوکوشیگا)

"ھا ھا وا وا کا
اوچی-سی کے تا چینوں
اوتورو وو
نیگی کی وو یا میرو
کو کو رو وا شیرازومو"

(میری والدہ میری صحت کے خراب ھو جانے سے پریشان ھیں مگر میرے دل میں جو درد ھے اس کی انہیں خبر نہیں)

(مس اساؤھارا)

———:o:———

"کو نو ھو کا جی
کانا شی کاری کے ری——الخ"

(جب میں اس کے دل کا خیال کرتی ھوں جس کو میں نے ناکام واپس کردیا تو مجھے یہ روشنی بہت اداس معلوم ھوتی ھے)

(مس تاکا کویزادا)

"نی گوری تارو
اموئی وا موتا جی——الخ"

(میں کسی قسم کے غمگین خیالات کو اپنے دل میں جگھہ ندوں گی مبادا وہ مورت دھندھلی ھو جائے جو میرے دل میں بسی ھے)

(مسز ھرو کو کتایاما)

"یو سوارو نو
نیرو نو افو کو و——الخ"

(جب میں اس کو ھلکے رنگ کی فلالین کا لباس پنہا دیتی ھوں تو یہ——میری کمسن بچی اور بھی نرم و گداز بدن نظر آنے لگتی ھے)

(مسز کشیکو واکا یاما)

———:o:———

کہیں کہیں واردات قلبی کے اشارات آجاتے ھیں جو بالکل نادر یا سوز باطن سے تپاں نظر آتے ھیں:—

"کے می نو کووا
نو سوری نو سوریتو
ھتی یو کو
کیمی دارو کے ری تو

دارے مو یاکو کانا

(جوان کچھووں کے آهسته آهسته چلنے سے مجھے ایک طرح کی کوفت هوتی هے۔ مگر اس کے وجود میں بالکل انهیں کی طرح چلتی هوں)

(مسز هیروکو کتایاما)

" یو کی کاایری
یاچی مان سوجی نو —— الخ "

(بچپن کے زمانے میں جب میں هچین کے بازاروں میں آئینه سازوں کی دوکانوں کے پاس سے گذرتی تو آئینوں میں اپنے کھر کی بندش کا عکس دیکھتی تھی)

(مسز اکیک یوسانو)

" هونو ناسو
هی نو فوسوما سی وو —— الخ "

(اگرچه میں اپنے آپ کو سرخ انگارے جیسی رضائیوں میں لپیٹ لوں مگر وه ٹھنڈے پڑے هیں یه میرا جسم۔یه میرا سینه!)

(بیگم کوجو)

" مونو ایو مو
کیکو مو یوروساشی —— الخ "

(جی چاهتا هے که دروازے کو میخیں ٹھوک کر بند کردوں اور اپنے کمره میں تنها بیٹھ‌کر روؤں کیونکه مجھه میں نه قوت کلام هے نه تاب سماعت)

(مس ساگا)

" هانا نو کانی —— الخ "

(اے نیند! میں پھولوں کی خوشبوؤں میں تمناؤں کے ساتھه تجھه تک پهنچی هوں۔اب تو ابدالاباد تک مجھه سے کناره نه کیجیو)

(مس تاچی بانا)

———:———

جاپانی شاعری میں خانگی زندگی کے گل بوٹے بھی هیں۔یه انسانیت کی وه علامات هیں جن کو ملک و نسل کا اختلاف متاثر نهیں کرتا۔مسز اوکاموتو جو مسٹر اپی اوکامتیو مشهور هجونگار کی بی بی هیں۔ان کی چار نظموں کو میں نے یکجا کردیا هے کیونکه ان کا موضوع ایک هی هے:—

" اسا شیمو یا
کو زینی تو ای تو —— الخ "

(صبح کو جب پالا پڑ رہا تھا مجھے ایک چور پر ترس آیا جو کچھ پیسے اور چاول چرا کر لے گیا)

(مسز هیرو کو کتیاما)

"نیت سوکے ری نو —— الخ"

(شب کے وقت جب مجھے نیند نہ آتی تھی میں نے اپنے پاؤں مچھر دانی کے ٹھنڈے دامنوں سے ملنے کی کوشش کی)

(مس مات سو موتو)

"رومینا نارو واری نی کاواری تی مونو کاؤ
توکیمی اوی یوکینو سمیوکی توتومونی
کائے نارے نو ایو تسوکا —— الخ"

(مجھہ عورت کے بجائے سردی میں بازار سے سودا خریدنے وہ گیا ھے۔اس کو خرید و فروخت کا تجربہ نہیں اس لئے غالباً وہ ایسی حالت میں گھر لوٹے گا کہ اس کے کپڑے پانی میں شرابور ھوں گے اور کوئی چیز خریدی نہ ھوگی—

وہ جس کو بازار کا کچھہ تجربہ نہیں ھے کچھہ پیاز خرید کر لایا ھے اور میں جب ان ڈالیوں کی سفیدی کو دیکھتی ھوں تو مجھے اس کی حالت پر بہت رحم آتا ھے۔

وہ ان کو اپنی پوٹلی کے سرے پر سے نکلنے سے نہ روک سکتا تھا اور پیازوں کی جڑیں پوٹلی کے باھر نکلی پڑ تی تھیں)

(مسز اوکامیڈو)

—:0:—

اس میں فطرت کی جھلکیاں بھی جابجا نظر آتی ھیں اور بعض سنی ھوئی یا دیکھی ھوئی چیزوں کے اثرات دل میں گھر کر جاتے ھیں:—

"مائی او جو وا —— الخ"

(صبح کا ستارہ اس طرح تنہا رہ گیا ھے کہ گویا اسے کہیں جانا ھی نہیں ھے اور بادخزاں چل رھی ھے)

"یو تو نیریبا —— الخ"

اس نظم کا میرے ایک شاگرد نے حسب ذیل ترجمہ کیا تھا:—

جب رات آتی ھے اور خاموشی سے ڈھکی ھوئی دنیا مسحور ھوجاتی ھے تو میں پہاڑ کے چشمہ کو پرانی کہانیاں گنگناتے ھوے سنتی ھوں—

(مسز یوسا نو)

"چی وا ھی تو تسو —— الخ"

(سورج برت میں سے نکل رہا تھا اور زمین ایک بڑا سفید کنول بنی ہوئی تھی۔

(مسز یوسانو)

"نیوری تی ساکو —— الخ"

(اے ابابیل! کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو ستون سے لگا ہوا اس طرح سے جھکا ہوا کھڑا تھا جیسے بارش میں گل چینی کھل کے لٹک پڑتا ہے)

(مس اساوھارا)

"پانا تو پانا —— الخ"

(حیرت ہے کہ یہ ہلکے ارغوانی اور سرخ رنگ کے پھول جو ایک دوسرے کے آگے گردنیں مٹکاتے ہیں تو یہ ایک دوسرے سے کیا کہا کرتے ہیں!)

(بیاکورن)

"اوموکی کے زی —— الخ"

(شب کے وقت سڑک پر سخت آندھی چل رہی تھی اور میں اپنے گرد و پیش کی تمام چیزوں سے یہ محسوس کرتی تھی کہ گویا سخت زلزلہ آگیا ہے)

(مسز ماسکو چینو)

"اریسو نو —— الخ"

(سینتا گا هانا کے ساحل کی ریتی پر موجیں پھیل پھیل کر روشن چاندنی میں ایک ھنگامہ بپا کر رھی ھیں)

(مسز کشی کو واکا یاما)

"کیورو کومو وا —— الخ"

(وہ سیاہ بادل کا ٹکڑا —— میرے دل کے لئے کتنا مسرت بخش نظارہ ہے کہ پر غضب سورج تک پر چھاگیا اور اٹھلاتا ہوا سامنے سے نکل گیا)

(مسز ھراتا)

—— : o : ——

مذکورۂ بالا نظموں میں تخیل کی جو پرواز نظر آتی ہے اسی نے بعض دوسری نظموں میں ایک مغربی رنگ اختیار کر لیا ہے:—

"کیورو کی سورا —— الخ"

(گھرے نیلگوں آسمان پر سبز مریخ اس طرح چمک رہا ہے کہ گویا اژدھے کی آنکھ میری موت کی خواستگار ہے:—

(مسز میسا کو چینو)

"واکا کی ھی وا —— الخ"

(نوجوانی کے عالم میں بہت سی ایسی باتوں کا شوق ہوتا ہے جو آسان نہیں- مثلاً کہکشاں کے نیچے رات بسر کرنا)

(مسز یوسا نو)

" رونا چو مایوای —— الخ "

(اس تیس سال کے عرصے میں میں ایک تنگ راستے پر اس ملک میں گشت کرتی رہی جس کو عورت کہتے ہیں)

(مسز ہیرا کوکتا یاما)

" ہے جیرو نو —— الخ "

(ایک رات خواب میں ایک ضعیف عورت نے جس کے کپڑے خاکستری رنگ کے تھے آکر میرے بالوں میں غم کا پھول اٹکا دیا)

(مسز میسا کوچینا)

ہر ملک میں عورت کی شاعری کا مرد کے مقابلے میں زیادہ پتے کی اور جذبات تنہائی کے بہتر ترجمان ہونا لازمی ہے - ولیم شارپ جب آخر کار اپنے آبائی زمانہ کے تکلیف دہ انکشافات میں مصروف ہوا تو اس نے اپنی شخصیت کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر فائنا مک لیوڈ کا بھیس بھر لیا تھا-جاپان میں مرد مغربی خیالات و مغربی جذبات سے متاثر ہو رہے ہیں- لیکن عورتوں کے قلوب کی جڑیں اس وقت تک قدیم تخیل کے تاریک و عمیق کووں تک پہنچتی ہیں-اس میں شک نہیں کہ تغیر ان میں بھی ہو رہا ہے اور مختلف حالتوں میں اس کی کیفیت مختلف نظر آتی ہے جیسا کہ مذکورۂ بالا نظموں کے ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے - اس شاعری کے میدان میں جو خود قوم کے برابر وسیع ہے-گو مجھے کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں تاہم اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بیگم کوجو قدیم حس و متانت کو ہاتھ سے ندینے میں معیار قرار دیجاسکتی ہیں-ان کے حسرت بھرے اور شیریں اشعار میں وہ درد پایا جاتا ہے جو بارہ صدی کی جاپانی شاعری کی شاید سب سے پائے دار خصوصیت ہے-اس کے ساتھ ہی ان کے کلام میں رضا بقضا کی ایسی کیفیت ہوتی ہے جو بطور خود دلکش تو ہے ہی مگر مذہب کی آمیزش اس کے حسن کو اور ہی دو بالا کردیتی ہے:—

" یاروسی نیکی —— الخ "

(میں نے ایک نقصان پر اپنے دل کو تسکین دی اور اپنے سینے پرونے میں مصروف ہوگئی اور بڑے بوڑھوں نے میری تعریف کی)

" یوگا سومی —— الخ "

(ایسے وقت جب که شام کی دھند مغرب کی پہاڑیوں کو ڈھانپے ہوتی ہے-میں اپنی خلوت میں افسوس کیا کرتی ہوں)

" ھوھو ایمیتی ——الخ "

(میں آج تمام دن مسکرائی اور سب میں بیگم بنی رہی)

" راکو جی تسو وا——الخ "

(وہ ڈوبتا سورج! یہ کسی سورما کی روح ہے جو شعلہ یا خون کی چڑھتی موج نظر آتا ہے!)

(بیگم کوجو)

——:O:——

اس خاتون کی شاعری کی زیادہ تر دلکشی ان چیزوں پر مبنی ہے جن کو یہ غیر مذکور چھوڑ دیتی ہے اس کیف سکوت پر جس میں اس کے اشعار ڈوبے ہوتے ہیں اور نیز اس تعلق کی احساس آفرینی پر جو ہمیں اپنی موجودہ زندگی کے عمیق تر علم سے محسوس ہونے لگتا ہے-یہی عنصری وجدان بعض دوسری شاعرات حاضرہ کے کلام میں بھی صراحتاً اور کہیں کنایتاً پایا جاتا ہے :—

" واگا تاما وا——الخ "

(کئی سال ہوے که میری روح بادیہ پیمائی کے لئے گئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی)

(بائی اکیورن)

" توری مو ناکازو——الخ "

(کوئی پرندہ اس وقت نہیں چہچہاتا-آج ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے-البتہ میری روح کی ہلکی ہلکی آواز آسمان میں سنائی دے سکتی ہے)

(مسز ہیرا کوکتایاما)

" آوکی پانا——الخ "

(جب تمہارے سانس سے میرے بال ہلنے لگے تو مجھے یوں معلوم ہوا که آسمان میں نیلے پھول کھل رہے ہیں)

(مسز میساکوچینو)

" ساکی نو یو نو——الخ "

سامنے دور سے چمکتا ہوا سمندر اس طرح نظر آرہا ہے که گویا آئندہ عالم میں بھی میرا گھر ہوگا اور مجھے اپنی طرف کھینچ لے گا)

(مسز تاکاکویازاوا)

——:O:——

زور حاضرہ کی شاعرات میں مسز یوسانو جنکی کچھہ نظمیں میں نقل کرچکا ہوں بہت مشہور هیں-ان کی شہرت کی زیادہ تر یہ بھی وجہہ ھے کہ ان کے قومی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ھے-ان کی شادی ایک معلم و شاعر سے هوئی تھی اور خود اگرچہ اپنے کثیر خاندان میں گھری رهتی هیں مگر اس کے باوجود اپنے علمی ادبی کاموں کے لئے وقت نکال لیتی هیں جن پر ایک مغربی خاتوں بھی فخر کرسکتی ھے-ان کی نظمیں خصوصیت کے ساتھہ تازہ اور پر مغز هوتی هیں ان کے کلام میں اکثر زمانۂ ماضی کے کسی خواب سے بیدار هونے کی-منظر عام-توقع-یا کسی قدیم باغ میں نئے پھولوں کے کھلنے کی کیفیت هوتی ھے:—

"کاکو نی یو وا——الخ"

(چونکہ زمانۂ سلف کی دنیا سمندر سے بھی زیادہ گہری ھے اس لئے کوئی موتی یا مونگا میرے هاتھہ نہیں آتا)

"هی نو یاما مو——الخ"

(کوہ آتش فشاں کی آگ دب جاتی ھے اور سمندر کی موجیں خاموش هوجاتی هیں مگر عشق کے زور کا کیا کیا جائے؟)

"هی تو فو کو نو——الخ"

(نو روز کے دن دوپہر کے وقت ایسا معلوم هوتا ھے کہ کل معمے جو آدم کے بچوں کو پریشان کرتے هیں حل هوگئے تھے)

"یاوا هاوا نو——الخ"

(تم نیکی کا تو وعظ کرتے رهتے هو مگر نرم جلد میں گرم خون کی روانی کو کبھی محسوس نہیں کرتے)

مسز یوسانو)

———:O:———

غرض اس قسم کی نظمیں آج کل توکیو کی مشہور شاعرات کے قلم سے نکلتی هیں-اگر کوئی شخص ان رسالوں میں سے بہترین نظمیں انتخاب کرتا رھے جو شاعری اور طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود کے متعلق جاپان کے مختلف حصوں سے شائع هوتے هیں تو اس قسم کا ایک کیا بہت سے انتخابات مرتب هوسکتے هیں-جاپان کے قریباً هر حصے سے ایسے رسالہ شایع هوتے هیں جن میں منظوم کلام هوتا ھے-هر جگہہ ایسے لوگ هیں جن کو کم از کم ایک عمدہ نظم یاد هوتی ھے لیکن ایسا کلام مشکل سے دستیاب هوگا جیسا کہ مس هائدی تاکا یامایا آنجہانی کا ذیل میں نقل کیا جاتا ھے:-

"مزو یوری مو——الخ"

جاپانی سے زیادہ ٹھنڈے رنگوں کی پوشاک پہنے ہوئے چاند اپنی سکوت میں دنیا کی خزاں (کا پیام) میرے دل تک پہنچاتا ہے)

اس قسم کی نظم سے ہم کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ہماری (انگریزی) زبان کی جدید شاعری کا کتنا بڑا حصہ ان پر سکون جاپانی تصورات سے جداگانہ نوعیت اور مختلف قدر و منزلت رکھتاہے-حقیقت میں جاپان کی خاص شاعری کا انگریزی نظم کے بعض بہترین حصوں ہی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے—

جب ہم صریحی اور ظاہری پہلو سے قطع نظر کرکے ان عمیق و دقیق انکشافات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو شاعری کی ترقی اور عظمت کی خاص علامات ہیں تو ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دو سب سے اعلیٰ اور نا قابل انفکاک عناصر اولیہ ہوتے ہیں-یعنی لحن اور استعارہ ہیں-انہیں کے ذریعہ سے ہمارے وجود کے نازک تر حسیات سے آخری خطاب کیا جاتا ہے-یہی ہم میں عروج کی وہ قدرتی شناخت پیدا کر دیتے ہیں جو تمام فنون لطیفہ کا معیار ہے-چونکہ جاپانی شاعری میں بعض غیر ضروری صوری پابندیاں ہیں اس لئے عالم کی وسیع تر پیچیدگیوں کا آئینہ ہونے کی حیثیت سے اس کا انگریزی شاعری سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا-لحن و استعارہ دونوں عالم کی غیر متناہی بو قلمونی کو یکرنگ وہم اہنگ بنانے کا ذریعہ ہیں-تانکا کے محدود دائرے میں قدیم جاپان کی رسمی و رواجی زندگی اور اس سے بچنے کی خواہش سے ایک معتدبہ حصہ کا اظہار ہوتا ہے-اس سخت پابندی کے توٹنے اور قوم کے دلوں میں تازہ ہواؤں اور پریشان کن آندھیوں کے آنے کے باعث اب نسبتاً بڑے اوزان رواج پاتے جاتے ہیں-بے قافیہ نظم کا طوفان یہاں بھی وہی کام کریگا جو اور ممالک میں کرچکا ہے-یعنی شاعر قدیم و جدید اصناف شعر میں حقیقی شاعری کی طرف زیادہ متوجہ اور مصروف ہوجائیں گے—

اب جو لوگ ان لیلیٰ وشوں کی طرح-جنکی نظموں کے یہاں یکجا کرنے کا فخر مجھے نصیب ہوا ہے-قدیم رواج کے مطابق اوتا لکھنا پسند کرتے ہیں وہ خود ہمارے شعرا کے ساتھہ ان انسانی خصوصیات میں ثبوت نسبت دیتے ہیں جن کو ہماری شاعری استعارات میں ظاہر کرتی ہے:—

Look how a bright star shooteth from the sky;
So glides he in the night from the Venus' eye.

اسی طرح وہ خاتون جس کو ہم بائی اکیورن کے نام سے جانتے ہیں تخیل میں وہ چونکا دینے والی وحدت پیدا کردیتی ہے جس کا کالرج نے اپنے ایک یادگار قطعے میں ذکر کیا ہے:—

"واکا کاتا نی ـــــ الخ"

(ایک ستارہ میری طرف دوڑتا ہوا آتا ہے- شاید مجھے کوئی ایسی خوشی ہونے والی ہے جو آج تک کسی کو نہ ہوئی ہوگی)

اگر ان استعارات و تشبیہات کا مطالعہ کیا جائے جن کو مغربی شعرا اپنے کلام میں لاتے ہیں تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ اس حسن کو بے نقاب کرتے ہیں جو شاعر کو بے خودی کے عالم میں متاثر کرتا ہے اور شعر کہتے وقت وہ اس سے کام لیتا ہے-اس قسم کا مطالعہ ہم کو شاعر کی شخصیت اور اس کے ذاتی امتیاز سے واقف کر دیتا ہے-

اوتا کے عمدہ نمونوں کو ہم اس قسم کے انگریزی اشعار سے تشبیہ دے سکتے ہیں جن کی مثال ٹنی‌سن کے مندرجۂ ذیل مصرعوں سے بہتر بہ مشکل میسر آئے گی:—

Short swallow flights of song that dip
Their wings in tears and skim away.

بحرالمحبت (مصحفی)

(از مولوی عبدالساجد صاحب)

———— :o: ————

رسالۂ اردو جلد اول نمبر ۴ (اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ ع) میں میرا ایک مضمون " مصحفی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی " کے عنوان سے نکلا تھا- جس میں میں نے اپنے پاس کے قلمی نسخہ کے مطابق مصحفی کی مثنوی بحرالمحبت تمام و کمال مع اپنے حواشی کے نقل کردی تھی- رسالۂ اردو میں اس کی اشاعت سے ایک مقصود یہ بھی تھا کہ اگر کسی صاحب کے پاس مثنوی مذکور کا کوئی دوسرا نسخہ موجود ہو تو مجھے اطلاع ہوجائے لیکن جب کسی طرف سے کوئی آواز نہ آئی تو سال بھر کے انتظار کے بعد آخر سنہ ۱۹۲۲ ع میں مثنوی مذکور کو علیحدہ کتابی صورت میں مع مقدمہ و دیباچہ اور حواشی میں اضافۂ مزید کے مطبع معارف (دارالمصنفین) اعظم گڈہ سے شایع کردیا- اب چند روز ہوئے خوش قسمتی سے ایک دوسرا نسخہ دستیاب ہو گیا- جس کی بنا پر طبع اول میں بعض ترمیمات ضروری ہوگئی ہیں- کتاب مذکور کو چونکہ بعض یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب درس میں داخل کرلیا ہے اس لئے تصحیح کی ضرورت و اہمیت اور بڑہ گئی ہے —

یہ نسخہ جناب شاکرحسین صاحب نکہت سہسوانی کی ملک ہے اور جناب سید محفوظ علی صاحب بدایونی کی وساطت سے مجھے ملا- ان دونوں صاحبوں کی عنایت کا شکریہ ضروری ہے- نسخہ خط نستعلیق میں بد خط لکھا ہوا ہے- ۱۸ × ۲۲ کی تقطیع پر ۱۸ صفحہ کی ضخامت ہے- جابجا کرم خوردہ ہے- مگر زاید نہیں- درمیان کے دو صفحہ کسی دوسرے شخص کے ہاتھہ کے معلوم ہوتے ہیں- طریق املا وہی خصوصیات رکھتا ہے جن کا آج سے سو برس ادھر عموماً رواج تھا- مثلاً " آ " کو " ۱۱ " لکھنا- " گ " پر ایک ہی مرکز لگانا- دو علیحدہ لفظوں کو ایک میں ملا کر لکھنا مثلاً "حق‌میں" کے بجاے " حقمیں ") وقس علیٰ ہذا- املا میں متعدد فاحش غلطیاں بھی موجود ہیں مثلاً —

"صعوہ" کے بجائے	"صعدہ"	لکھا ھے	(شعر ۳۴)
"پرتاب" ..	"ترباب"	..	(شعر ۱۹۳)
"جرخ" ..	"جزع"	..	(شعر ۳۲۰)
"پدید" ..	"برید"	..	(شعر ۱۷۸)
"پروا" ..	"پرواہ"	..	(شعر ۱۸۰)
"مثنوی" ..	"مسنوی"	..	(خاتمہ)

عنوان پر بجاے محض نام کتاب کے یہ الفاظ ھیں:-"مثنوی بحرالمحبت مصحفی به جواب دریاے عشق میر تقی"-خاتمہ پر یہ عبارت تحریر ھے:—

"مثنوی در جواب دریاے عشق میر محمد تقی صاحب سلمه من کلام میاں مصحفی صاحب سلمه الله تعالی-نوشتۂ عاجز خاکسار گنهکار مهر علی بیگ به وقت سه پهر به روز پنجشنبه به تاریخ بست وهشتم تمام شد سنه ۱۲۲۵ هجری—

نوشته به ماند سپه بر سفید—— نویسنده را نیست فردا امید
هرکه خواند دعا طمع دارم—— ز انکه من بندۂ گنهکارم"

سنہ کے اعداد کی کتابت زرا مشتبہ معلوم ھوتی ھے-یعنی شبہ ایسا ھوتا ھے کہ بعد کو کسی دوسرے شخص نے انھیں لکھا ھے-لیکن میر تقی کے نام کے ساتھ "سلمه" کا اضافہ ھے-جس سے معلوم ھوتا ھے کہ وقت کتابت وہ زندہ تھے اور ان کا سنہ ۱۲۲۵ ھجری تک زندہ رھنا مسلم ھے-اس لئے یہ شبہ زیادہ قوی نہیں رھتا-سنہ و تاریخ کے اندراج کے ساتھ مہینہ کا ذکر نہ ھونا بھی زرا کھٹکتی ھوئی بات ھے—

یہ نسخہ جسے سطور ذیل میں میں نسخۂ ب سے موسوم کروں گا متعدد حیثیات سے اس نسخہ سے جس کو میں نے شایع کیا ھے اور جس کے لئے سطور ذیل میں نسخہ الف کی اصطلاح ھوگی مختلف ھے-ب کا سال کتابت سنہ ۱۲۲۵ ھجری اگر صحیح ھے تو گویا الف کے سال کتابت سنہ ۱۲۴۱ ھجری سے وہ سولہ سال قدیم ھے-اور ب کی عبارت خاتمہ اس امر کو ثابت کررھی ھے کہ مصحفی نے میر کی دریاے عشق کا جواب انھیں کی زندگی میں تیار کرلیا تھا-ب کے عنوان اور خاتمہ دونوں کی عبارتوں میں "جواب دریاے عشق میر تقی" موجود ھے-اس سے معلوم ھوتا ھے کہ تالیف کے وقت اس کی "جوابی" حیثیت مخفی و مشتبہ نہیں بلکہ اچھی خاصی نمایاں تھی-الف میں یہ جوابی حیثیت نمایاں نہیں-اس کے آغاز میں صرف اس قدر عبارت ھے-"مثنوی میاں مصحفی سلمه که برطبق مضمون مثنوی دریاے عشق که از میر تقی مرحوم است گفته اند"-"برطبق مضمون" اور "در جواب" کا مفہوم ظاھر ھے کہ بالکل متحد نہیں-الف میں اشعار پر نمبر میں نے ڈال دئے ھیں-ان میں جن اشعار میں میر تقی کے حق تقدم و فضیلت کا اعتراف کیا گیا ھے اتفاق سے

ب میں وہ اشعار یا تو سرے سے غایب ہیں مثلاً اشعار نمبر ۳۵۲ تا نمبر ۳۵۶ اور یا اس شعر میں میر کا نام مسخ ہو گیا ہے۔مثلاً شعر نمبر ۹ الف میں یوں درج ہے —

گرچہ ہے کلک میر نادرکار   توبھی ندرت کو اپنی کر اظہار

ب میں مصرعۂ اولیٰ ان الفاظ کے ساتھہ ملتا ہے:—

گرچہ ہے کلک مرد نادرہ‌کار

ب کے دستاب ہونے کے بعد الف میں جو جو ترمیمات ضروری ہوگئی ہیں ان کے لئے تو ناظرین کو مثنوی کے طبع ثانی کا انتظار کرنا چاہیے-البتہ ذیل میں میرے مطبوعہ نسخہ اور ب کے اختلافات کی فہرست درج کردی جاتی ہے- جو اختلافات بالکل واضع سہو کتابت یا سوء کتابت کا نتیجہ تھے انہیں میں نے قلم انداز کر دیا ہے-بہت سے مواقع اختلاف پر میں اسی خواندگی کو ترجیح دیتا ہوں جو میرے مطبوعہ نسخہ میں موجود ہے-تاہم بہت سے مواقع پر ب کی خواندگی قابل قبول ہے-ذیل میں محض دونوں خواندگیوں کے اختلافات کی فہرست درج کی جاتی ہے-محاکمہ اور تعئین صحت کا یہ موقع نہیں —

نمبر شعر	عبارت نسخۂ مطبوعہ	عبارت نسخۂ ب
عنوان	مثنوی بحرالمحبت	مثنوی بحرالمحبت مصحفی بہ‌جواب دریاے عشق میر تقی
۷	طراحیوں	طراضیوں
۷ مصرعہ اولیٰ	کھنچا	کھچا
۷ مصرعہ ثانیہ	لکھا	کہا
۸	بھی	تو
۹	ہے کلک میر نادر	کلک مرد نادرہ
۱۰ مصرعہ اولیٰ	میں	پہ
۱۰ مصرعہ ثانیہ	حسن	رنگ
۱۱	سے	پہ
عنوان	آغاز داستان آں جوان	× (جگہ چھوٹی ہوئی عبارت غایب)
۱۴	داغ پر داغ	گھاؤ پر گھاؤ
۱۵	چڑھی تھیں	چڑھیں تھی
۱۸	مجنون	مجنون

۲۵	کہ کسی کوچہ میں جو جا نکلا	ایک کوچہ سے جو جا نکلا
	اس کے بھی دل کا مدعا نکلا	اس کے دل کا بھی مدعا نکلا
۲۶	دل تھا اس کا جو	دل جو تھا اس کا
۳۰	لگ کے	تک کے
۳۱	مژہ سے ھو کے بہا	ھو مژہ پہ بہا
۳۱	کچھہ نہ اس کا	اس کا کچھہ نہ
۳۹	میں وو ھیں	وھیں سے
۴۱	گیا	گئی
۴۴	بسکہ	یوں جو
۴۴	صرت	حرت
۴۵	پہ	پے
۴۹	لوھو	لہو
۵۱	بندہ	بحر
۵۲	حسرت	حیرت
۷۳	دھائیے	ڈھائیے
۹۳	چشم	تیر
۹۵	ھمدم	مونس
۱۰۱ مصرعۂ اولیٰ	ھے	ھین
۱۰۱ مصرعۂ ثانیہ	اب عذاب ھے	کے عذاب ھیں
۱۰۵	ھی	بھی
۱۰۸	چھوٹتا	چھٹتا
۱۱۵	دل	جی
۱۱۷	جب نہ بن آئی	نہ بن آئی جب
۱۱۷	یہی سوچے	پھر یہ سوجھی
۱۲۵	رات دن رھے تھے	رھتی ھے بہت ھی
۱۳۶	واں سے	وھاں
۱۳۷	چل	تو
۱۳۸	سچ ھے	سمجھے
۱۳۸	اس کا	ادنی
۱۴۲	وہ	یوں
۱۴۲	چشم و التفات	چشم التفات

۱۴۳	وحشت	دہشت
۱۴۴	اس	ان
۱۴۴	اسیر	سفیر
۱۴۵	دابہ وحشت	دل کی دہشت
۱۴۷	مین	پہ
۱۴۷	کو	کے
۱۵۰	کس	جس
۱۵۳	سے	میں
۱۵۷	راہکز	رہکہ از
۱۵۷	باد	باؤ
۱۵۸	دیکھے	دیکھوں
۱۵۸	مذلتیں	اذیتیں
۱۶۱	رخصت	حضرت
۱۶۲	کرکے نالہ بہ طرح	رکھہ کے نالہ پہ طرح
۱۶۳	کاے	کہ
۱۶۳	جی	اس
۱۶۶		(شعر غایب)
۱۶۷	ہوئے محض	ہو وہ عشوہ
۱۶۸	جاے بار	جان زار
۱۷۰ مصرعۂ اولیٰ	تغافل	تجاہل
۱۷۰ مصرعۂ ثانیہ	تجاہل	تغافل
۱۷۳	کاے	اے
۱۷۵	سے	کو
۱۷۵	فرقت	فرصت
۱۷۶	جو	سو
۱۷۷	ہم و ثاقی	وہم باقی
۱۷۹	آبس اب	بس اب اس
۱۸۰	مل ہی	ہی مل
۱۸۶	جو یاں	جو یوں
۱۸۷	وہ	یہ
۱۹۱	بہ	در

۱۹۲	خاصه	خاص
۱۹۳	بتر	شریر
۱۹۳	ابتر	ابثر
۱۹۴	خاکساروں	عشقبازوں
۱۹۵	تہا سب کو	یہ تہا سب
۱۹۸	کو	اور
۱۹۹	نزار	زار
۲۰۰	واں ھی آ	یہ بھی واں
۲۰۳ — ۲۰۸		(کل اشعار غایب)
۲۰۹	محشر	حشر
۲۱۲	ڈوبے تھے کتنے	ڈوبی تھی کشتی
۲۱۳	تہ	بر
۲۱۵	دید	دیدہ
۲۱۶		(شعر غایب)
۲۱۷	وہ	کچھہ
۲۲۲	اس کے سے کی جو کفش نے	سے اس کے کفش نے کیا
۲۲۴		(شعر غایب)
۲۲۸	طے کیا	پہنچا
۲۲۹	ھوا	ھو کے
۲۳۲	عقل	خلق
۲۳۳	اس	ان
۲۳۴	لینے پہ	لینا یہ
۲۳۷-مصرعہ ثانیہ	لیا	کیا
۲۴۳	اس صنم کو پار	پار اس صنم کو
۲۴۳	وحشت	حیرت
۲۴۵	رہ گیا	ھو گیا
۲۵۰-مصرعہ اولی	صحبت	خلوت
۲۵۰-مصرعہ ثانیہ	خلوت	صحبت
۲۵۰-مصرعہ ثانیہ	ان کو	اس کو
۲۵۳		(شعر غایب)
۲۵۸	سے	یہ

۲۵۹	رهیں	گئیں
۲۶۴	ره	وهی
۲۶۴	میرے	اپنے
۲۶۵	کوآلے	سودا لے
۲۶۷	سر	دل
۲۶۸	آتا	آئے
۲۶۹	بیٹھی	مٹی
۲۷۰		(شعر غایب)
۲۷۱	دایه نے یوں کہا	بولی یه دایه اے
۲۷۲		(شعر غایب)
۱۷۴		(شعر غایب)
۲۷۸		(شعر غایب)
۲۸۱		(شعر غایب)
۲۸۲		(شعر غایب)
۲۹۴	منه کو اپنے ملتے	اپنے منه کو مل کے
۲۹۸		(شعر غایب)
۲۹۹	میں (مکرر)	پر (مکرر)
۳۰۲	پر وه خسته ڈوبا تها	تها وه خسته دل ڈوبا
۳۰۳	گه (مکرر)	پر
۳۰۴	به مرا دم رسم ته گرداب	اور وه مردم رها بے گرداب
اضافه	——	کفش پر میری جی دیا اس نے یا الهی یه کیا کیا اس نے
۳۰۷	میں	کو
۳۱۴	کوئی	یک
۳۱۵	دایه غافل تهی	دایهٔ غافل
۳۱۶	تیری	تیرا
۳۱۷	هی	تها
۳۲۲	لے کے پاوں سے	لپٹیں بالوں کے
۳۲۵	منه	سه
۳۳۰	هوئے (مکرر)	هوا
۳۳۵	لب	آب

ادب

بانگ درا

اقبال اس وقت اردو کے سب سے مقبول اور اعلیٰ شاعر ہیں-ان کا کلام اب تک متفرق تھا اور ایک جا جمع ہوکر شایع نہیں ہوا تھا-ان کے کلام کے دلدادہ اس سے مطمئن نہ تھے اور ایک مدت سے منتظر اور مشتاق تھے کہ سارا مجموعہ کتاب کی صورت میں شایع ہو جائے-کس قدر مسرت کی بات ہے کہ وہ آب دار موتی جو اب تک بکھرے ہوئے تھے ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہیں-جن کی جوت سے آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے—

کتاب کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑتی ہے ''ہمالہ'' ہے-کوہ ہمالہ ہندوستان کی شوکت و شان کا نشان اور اس کے حفظ و امن کا پاسبان ہے-ہندوستان کا بچہ بچہ اسے جانتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے-جس شاعری کی ابتدا ''کوہ ہمالہ'' ہو اس کی انتہا کیا ہوگی؟ میں اقبال کے لئے اس میں نیک شگون پاتا ہوں-وہ محاسن جو بعد میں ہم نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اقبال کے کلام میں نکالے ان سب کے بیج اس نظم میں نظر آتے ہیں-تخیل، تشبیہات، بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہے ہیں-لیکن سب سے بڑی بات جو ہم اس میں دیکھتے ہیں اور جو اپنا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حب وطن کی بو آتی ہے-اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی مہک بھی بڑھتی جاتی ہے-چند ہی صفحوں کے بعد ''صدائے دل'' کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم ہے-شاعر درد دل سے چیخ اٹھتا ہے اور اپنے ملک کی بد نصیبی پر آنسو بہاتا ہے—

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

بدلے یکرنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

اس کے نیچے ہی ہندؤں کے مقدس منتر گایتری کا ترجمہ ہے جو اس قدر پاک خیال کیا جاتا ہے کہ غیر برہمن کے کان میں اس کی آواز تک پہنچنا ناجائز سمجھا جاتا ہے۔گویا جس اخوت کی انہیں تلاش تھی اس کے لئے پھولوں کا ایک ہار گوندھا ہے۔چند نظموں کے بعد سیدھی طرح تربت ہے جس پر یہ ہدایت درج ہے—

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

اس سے ذرا آگے ایک اور نظم "تصویر درد" آتی ہے جو درحقیقت بے مثل اور سراپا درد ہے اور شاعر نے دل کھول کے اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے—

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

—:0:—

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں؟
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں!
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

اسی نظم کے ایک بند میں کس حسرت سے یہ شعر کہا ہے—

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

اور کیا خوب کہا ہے—

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

اسی نظم میں ایک شعر ہے جو ملک کی اس وقت کی حالت کا صحیح نقشہ ہے-

تعصب چھوڑ ناداں! دھر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

چند ہی ورق لوٹنے کے بعد "ترانۂ ہندی" آتا ہے جسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو شاید ہے کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو اور قومی گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے-عام و خاص-عالم و جاہل سب کی زبان پر جاری تھا-اس کا ایک ایک لفظ حب وطن میں ڈوبا ہوا ہے—

اس کے بعد ہی "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہے جو وطن کی محبت کا راگ ہے اور جس کا پانچواں مصرعہ یہ ہے-"میرا وطن رہی ہے میرا وطن وہی ہے" یہ گیت ختم ہوتے ہی ایک اور نظم آتی ہے جس کا نام "نیا شوالہ" ہے-یہ شاعر کے انتہائے کمال کا نمونہ ہے-اس کے ہر شعر میں حب وطن کی آگ بھری ہوئی ہے-یہ وہ نظم ہے جو ہر انجمن اور ہر کانگریس کے ہال میں سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے اور ان کے استیجوں پر بجائے بدنما کرسیوں اور میزوں اور مہمل اور بے معنی آرائش کے نیا شوالے کی تعمیر ہونی چاہئے جہاں ہر پرستار وطن کا سر جھک جائے اور پھر یہیں سے عالمگیر محبت اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو-اس نور کی جھلک ہر مذھب میں پائی جاتی ہے لیکن اس کی تکمیل کسی نے نہیں کی-ہر زمانے میں ایسے پاک نفس اور حق پرست لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اتحاد و محبت کا بیج بونا چاہا لیکن ان کی کوششیں تھک کر ایک فرقے میں محدود رہ گئیں-شاعر ان تمام فرقہ سازیوں اور فرقہ بازیوں کو مٹانا چاھتا ہے-ہر انسان جو تعصبات اور روایات کے گرد و غبار سے الگ ہو کر انصاف کے ساتھ غور کریگا تو اسے وہ حقیقت نظر آئیگی جہاں شاعر کی نظر پہنچی ہے-لیکن تعصبات پھر غالب آجاتے ہیں-

اور آئینۂ دل کو مکدر کر دیتے ہیں- میں یہ نہیں کہتا کہ جہاں شاعر پہنچا ہے وہاں تک کوئی اور نہیں پہنچا- بیشک بعض لوگ وہاں تک پہنچے ہونگے لیکن انہیں اظہار حق کی توفیق نہیں ہوئی- اقبال نے اس حقیقت کو بلا خوف ملامت ظاہر کر دیا- لیکن اس پر قائم کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے- ہم اس وقت جو جو جتن ملک میں محبت و اتحاد قائم کرنے کے لئے کر رہے ہیں وہ سب اوپری اور عارضی ہیں- حقیقت سے دور اور حق سے نا آشنا ہیں- وحدانیت اور اتحاد کا راز نئے شوالے میں ہے—

نئے شوالے کے ساتھ ہی اقبال کی شاعری کا پہلا دور ختم ہوتا ہے- اس دور کا نام میں نے حب وطن رکھا ہے- دوسرے دور آغاز اس مجموعے کے دوسرے حصہ سے ہوتا ہے جسے میں نے حب ملت کے نام سے موسوم کیا ہے- اس کی ابتدا سنہ ۱۹۰۵ ع سے ہوتی ہے- یہ وہ زمانہ ہے جب وہ انگلستان تشریف لے گئے ہیں- انگلستان ہمارے نوجوانوں کی کسوٹی ہے- ان کے اصل جوہر وہاں جا کر کھلتے ہیں- ان کے لئے وہ ایک نیا عالم ہوتا ہے- جدید تمدن کی روشنی بعض اوقات ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے کچھ دنوں کے بعد جب سنبھلتے ہیں تو اپنے امتحانات کے دھندے میں لگ جاتے ہیں اور اس سے جو وقت بچتا ہے وہ نئی لطف اندوزیوں میں بسر ہو جاتا ہے- کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں وطن کی لو لگی ہوتی ہے وہ طرح طرح کے منصوبے گھڑتے اور وطن کی خدمت کے لئے نئے نئے خیالات سوچتے ہیں- بعض تو نہر سویز تک پہنچتے پہنچتے دھیمے پڑ جاتے ہیں اور کچھ جو ثابت قدم رہتے ہیں شروع شروع میں یہاں آکر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن وہ چنگاری جو سات سمندر طے کر کے سلگتی ہوئی آئی تھی گرد و پیش کے حالات اور صحبتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ بجھ کے خاک ہو جاتی ہے- البتہ اکا دکا ایسا نکل آتا ہے جو با وجود موانعات کے کام کرتا رہتا ہے اور کچھ کر گزرتا ہے- گو کہنے کو وہ امتحانوں کے لئے انگلستان جاتے ہیں لیکن اصل امتحان ان کا ہندوستان میں ہوتا ہے جس میں اکثر ہیٹے نکلتے ہیں- اس کا دوس تنہا انہیں پر نہیں بلکہ ہمارے ملک کی حالت- تعلیم کا طریقہ- گھروں کی صحبت- انتخاب کی غلطی اور اسی قسم کے اور اسباب بھی اس کے زمہ دار ہیں اور ان کو الزام دینا ہی غلطی ہے- وہ نہ اس خیال سے جاتے ہیں اور نہ ان خیالات کو لیکر آتے ہیں- وہ جس غرض سے جاتے ہیں اسے کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتے ہیں- لیکن اقبال کا جانا اس عام گلے کا سا جانا نہ تھا جو ہر سال یہاں سے جہاز بھر کر دیار مغرب کو جاتا ہے- وہ ایسے وقت گئے تھے جب کہ ان کی طبیعت اور سیرت میں پختگی آچکی تھی- ملک کی حالت سے واقف اور زمانے کے تیور پہچان چکے تھے- دل میں حب وطن کی لو لگی ہوئی تھی- ملک میں ان کا کلام مقبول ہو چکا تھا اور اقبال کا ترانہ اور وطن کے گیت دیس کے گلی کوچوں میں گائے جا رہے تھے- یورپ میں ان کی آنکھوں نے کیا کیا تماشے

دیکھے۔کیا کیا خیالات دل میں موجزن ہوئے۔کیسے کیسے منصوبے سوچے۔کیا کیا سامان اپنے ملک کے لئے جمع کئے۔کیسے کیسے ارادے تھے جو دل ہی دل میں رہ گئے۔یاد وطن نے کس کس طرح بیقرار رکھا اور اپنی قوم کی پستی کو دیکھ کر دل پر کیا کیا صدمے گزرے اور اس کے ابھارنے کے لئے کیا کیا ولولے پیدا ہوئے ؟ ان کا جواب یا تو وہ خود دے سکتے ہیں یا ان کا کوئی رازدار دوست۔لیکن اس زمانے کے کلام کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نئے مشاہدات اور خیالات نے ان کے دل میں ایک جوش اور تلاطم پیدا کر رکھا ہے جن کے اظہار کے لئے وہ بیتاب اور مجبور ہیں۔ان خیالات کو انہوں نے اس نظم میں موزوں کیا ہے جو شیخ عبدالقادر صاحب کے نام ہے جو یورپ میں ان کے ہم سفر۔ہم مشرب و ہم راز تھے۔یہ گویا ان کی آئندہ زندگی کا پروگرام ہے جس پر وہ خود عامل ہونا چاہتے ہیں اور دوسرے کو عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔اس خط کے یہ دو شعر ان کے دردِ دل کو ظاہر کرتے ہیں—

گرم رکھتا تھا ہمیں سردئی مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

انگلستان کے قیام کے زمانے اور اس کے بعد کے کلام سے دو باتیں خاص طور پر معلوم ہوتی ہیں جنہوں نے ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ایک تو یہ کہ یورپ کے جدید تمدن کا طلسم ان کی نظروں میں مکڑی کے جالے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا جو محض خود غرضی اور خود پرستی پر مبنی ہے اور بنی نوع انسان کے حق میں سم قاتل ہے اس پر انہوں نے بڑی بڑی کاری ضربیں لگائی ہیں۔ان کے یہ شعر مشہور اور زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں—

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

دوسرے وہ یورپ کی وطنیت اور قومیت سے جس کا اثر تمام یورپ پر چھایا ہوا ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پھیلتا جاتا ہے سخت بیزار ہیں۔وہ اس تنگ نظری اور خود غرضی کو دنیا کے لئے باعث ہلاکت اور موجب آفت خیال کرتے ہیں چنانچہ یورپ کی جنگ عظیم سے جو بربادی یورپ اور عام طور پر دنیا پر نازل ہوئی اس کا بدیہی ثبوت ہے۔اس بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی اخوت و مساوات کی طرف مائل ہوتے ہیں اور یورپ کی معاشرتی اور معاشی اور سیاسی زندگی جو

بے روح اور صداقت سے خالی ہے انہیں اس عقیدے پر اور مستحکم کردیتی ہے۔اس طوفان سرمایہ‌داری و استبداد میں انہیں ایک ہی روشنی نظر آتی ہے جو دنیا کو نجات دے سکتی ہے اور جو جغرافی حدود اور نسل و رنگ کے قیود سے بالا ہے—

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اسی خیال کو دوسرے انداز سے بیان کرتے ہیں

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اور اسی وجہ سے وہ ہندوستان کی ان کوششوں کو جو ملک کے محب وطن اتحاد پیدا کرنے کے لئے کر رہے ہیں مسلمانوں کے حق میں ایسی ہی ہیچ و پوچ سمجھتے ہیں جیسے مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کی کوششیں اتحاد عالم کے لئے۔چنانچہ فرماتے ہیں۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہوجا

اور یہی وجہہ ہے کہ انہوں نے ”ترانۂ ہندی“ کے جواب میں ”ترانۂ ملی“ لکھ کر اس کے اثر کو کم کرنا چاہا جو ان کے اختیار سے باہر تھا۔اس کے بعد ”وطنیت“ کی نظم میں کھلم کھلا اپنے عقیدے کا اعلان کردیا ہے اور مسلمانوں کو اس تازہ آفت سے بچنے کی ہدایت کی ہے کہ وطن پرستی بھی بت پرستی ہے—

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس کے بعد کہتے ہیں—

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بنتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وہ ان خیالات کو بار بار اس سے زیادہ جوش اور حسن کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس سیاسی وطن کو اصول اسلام کے خلاف بتاتے ہیں۔ان کی نظروں میں قرون اولے کا سماں سمایا ہوا ہے۔وہ وہی سادگی۔حمیت۔ایثار اور اخوت چاہتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ مسلم اپنی قدر اور اسلام کی حقیقت سمجھے۔وہ فخر کائنات ہے اور یہ زمانہ جو صداقت سے بیگانہ ہے ان اصول کا منتظر ہے جو اسلام کی تعلیم مین پنہاں ہیں—

دھر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی میں ہوا
میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

وہ نصاری وضع اور ہنود سیرت مسلمان کو مسلمان نہیں سمجھتے۔وہ مغربی تہذیب اور اس کی رعنائیوں میں منافستہ اور خود فروشی۔اس کی جمہوریت میں استبداد۔اس کے آئین میں قیصریت دیکھتے ہیں۔اشاعت تعلیم و تہذیب کے دعوے۔اصلاح و تنظیم کی مجلسیں۔حقوق و مراعات کی قرار دادیں دھوکے کی ٹٹیاں ہیں جن کی آڑ میں مغرب کا فرمانروا اقوام عالم کا شکار کھیلتا ہے۔لیکن یہ سب تدبیریں اور حکمتیں ناپائدار ہیں۔عنقریب مٹنے والی ہیں۔دنیا بہت جلد ان سے تنگ آجائے گی اور بری طرح انتقام لے گی۔اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس رمز کو سمجھہ جائیں آنے والے دن کے لئے ابھی سے تیار ہو جائیں۔ان میں پھر وہی پہلی سے اسلامی حرارت پیدا ہو۔وہی عزم اور ولولے ہوں۔وہی مساوات اور اخوت ہو۔ان کی منتشر جمعیتیں ایک شیرازے میں بندھ جائیں مختلف فرقے اور مختلف اسلامی دولتیں ایک ہوجائیں۔تاکہ وہ دنیا کی رہنمائی کرسکیں۔دنیا اپنی حالت سے بیزار اور اپنے آئین سے تنگ آگئی ہے۔وہ خودکشی پر آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ایسی حالت میں اگر کوئی آڑے آسکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔کیونکہ دنیا ایسے نظام کی منتظر ہے جو سرمایہ داری سے پاک ہو۔جس میں حاکم و محکومیت کا کوئی امتیاز نہو۔جہاں امیر و غریب ایک ہوں۔جسکی تہذیب میں نفسانیت اور تعلیم میں دنائت نہو جس کا خدا ایک۔جس کا آئین ایک۔جس کا خیال ایک اور جس کا مطمح نظر ایک ہو۔اور جو شروع سے آخر تک توحید ہی توحید ہو اور کہیں دوی کا نام نہو۔ایسا نظام سوائے اسلام کے اور کونسا ہوسکتا۔وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ اسلام کا بول بالا ہوگا دنیاکی اقوام اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونگی۔اس کی پاک تعلیم سے پرانا ناسور مندمل ہوگا۔امن و امان اور اخوت و مساوات کا دور ہوگا۔اس وقت سچا مسلم اقوام عالم کا امام اور اس جہاں کا خلیفہ ہوگا۔یہ ہے وہ آرزو جو ہمارے شاعر کے

دل میں موجزن ہے اور جس پر اس نے اپنے فلسفہ اور شاعری کی ساری قوت صرف کردی ہے۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خون مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کے مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑگیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں—

یہ نکتہ سر گزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

ایک چھوٹی سی نظم تین بیتوں کی مذہب پر لکھی ہے جو یہ ہے

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نکر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ملت نہ وطنیت پر ہے نہ قومیت و نسل پر بلکہ مذہب پر ہے۔اس کی قوت اور اتحاد سیاست یا قانون پر نہیں بلکہ دین پر۔ مذہب ان کے شیرازۂ اتحاد کو جو اب ڈھیلا پڑگیا ہے مضبوط کریگا۔اسی کی بدولت سب مختلف اور منتشر قوتیں ایک جا ہوں گی اور اسلامی ملت ایشیا کی نہیں سارے عالم کی رہنما اور امام ہوگی۔ایک نئے دور کا آغاز ہوگا اور سرمایہ داری اور استبداد۔سیاست اور رقابت کا خاتمہ ہوجائے گا۔یہ ہے اقبال کا خواب جس کی تعبیر پردۂ خفا میں ہے اس کے یہ معنے نہیں کہ دوسرے مذاہب یا اقوام سے نفرت کرتا ہے یا ان سے تعصب رکھتا ہے۔نہیں۔ بلکہ اس نے رام۔ نانک۔سوامی تیرتھ رام پر بھی ایسی ہی سچائی اور جوش سے نظمیں لکھی ہیں جیسے اپنے پاک نفس بزرگوں کے لئے۔معلوم ہوتا ہے کہ مدت کے غور و فکر اور تجربہ کے بعد اس نکتے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کی اقوام کی یکجہتی کی بنیاد سوائے ملت اسلام کے بودی اور خلل پذیر ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سوائے ملت اسلام کے کسی قوم کو دنیا کی خلافت کا اہل نہیں سمجھتے۔انہوں نے جو کچھ اس بارے میں لکھا ہے اس کا ایک ایک لفظ خلوص۔ صداقت اور جوش سے بھرا ہوا ہے۔وہ عاشق و شیدائے اسلام ہے اور عاشق کو ہر جرم معاف ہے—

غالباً یہی وجہ ہے کہ آخر آخر میں ان کا میلان طبع فارسی کی طرف زیادہ ہوتا گیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنے خیالات آسانی سے ممالک اسلام میں شایع کرسکیں اور ملت اسلام کو ایک جمعیت بنانے میں مدد دے سکیں۔کیونکہ جب اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو شاعر کی درد بھری آواز لوگوں کے مردہ دلوں میں کھولن پیدا کرتی ہے اور انقلاب عظیم کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔جناب شیخ عبدالقادر صاحب نے اس مجموعے کے شروع میں ایک پر لطف دیباچہ لکھا ہے جو صرف شیخ صاحب ہی لکھہ سکتے تھے۔اس میں انہوں نے اقبال کے کلام پر تنقید نہیں کی بلکہ ان کی شاعری کا نشوو نما اور تدریجی ترقی دکھائی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔اس میں فرماتے ہیں " دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا۔یعنے اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعۂ خیال بنا لیا " اس کے شیخ صاحب نے کئی اسباب بتائے ہیں۔جنہیں میں انہیں کے الفاظ میں ادا کرنا چاہتا ہوں—

" فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب حالات تصوف کے متعلق لکھنے کے لئے جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیر مذاق میں دخل ہوگا۔اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہوگئے۔مگر بظاہر جس چھوٹے سے موقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدہ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔مگر کچھہ ایسا وقت تھا اور اس فرمایش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی جو مجھہ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں کہتے تھے مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہوگیا "—

شیخ صاحب نے جو کچھہ فرمایا ہے اس میں جاے دم زدن نہیں۔بیشک یہی

اسباب فارسی کی طرف ان کے میلان طبع کے ہوئے ہوں گے۔ لیکن جس چیز نے مستقل طور پر فارسی میں کہنے کی طرف مائل کیا وہ وہی خیال ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یعنے ملت اسلام کے افتراق و نفاق کو دور کرکے اسے ایک قوی جمعیت بنانا جس کی بنا خالص اسلام پر ہو۔ اسے کاہلی اور نکبت سے نکال کر عمل اور جد و جہد کی طرف مائل کرنا۔ اہل ملت میں وہ سیرت اور خلوص پیدا کرنا کہ ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے ہاتھ میں شمع ہدایت ہو اور بالاخر انہیں اقوام عالم کی سرداری اور امامت کے لئے آمادہ کرنا۔ یہ تعلیم ان کے تمام مسلمانوں کے لئے ہے خواہ وہ کسی ملک اور کسی نسل کے ہوں—

لیکن ہند کے مسلمان عجیب کش مکش میں ہیں۔ جب حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ نشۂ دولت سے ذرا ہوشیار ہوئے تو ہادی نے انہیں یہ ہدایت کی کہ دول اسلام سے تعلق یا محبت رکھنا خلاف مصلحت ہے۔ ادھر اہل وطن سے یک جہتی دشوار ہے کیونکہ وہ تعداد میں زیادہ اور ہم کم ہیں۔ اگر رہے تو ان کے تابع ہو کے رہنا پڑیگا۔ بس ایک ہی صورت ہے کہ انگریزوں سے جو فرمارواے ملک ہیں مل کر رہو۔ اسی میں تمہاری خیر اور تمہاری زندگی ہے۔ ایک مدت اسی پر کاربند رہے۔ لیکن سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں۔ یہ طلسم بھی ٹوٹ کے رہا۔ اس کے بعد رموز سیاست کے شناسا اور زمانے کے نباض آئے اور ہدایت فرمائی کہ اگر ہمیں عزت کے ساتھ زندہ سلامت رہنا ہے تو اہل وطن سے یک جہتی اور اتحاد پیدا کریں ورنہ ملک ہمیشہ پامال رہے گا اور ملک والے کبھی غلامی سے نہ نکل سکیں گے۔ سارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک صلح و آشتی کی لہر دوڑنے لگی۔ اتحاد واتفاق کے ترانے گائے جانے لگے اور لوگوں کے سینے صلحکاری اور محبت کے نور سے معمور نظر آنے لگے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک مدت کے بعد اس ملک پر خدا کی رحمت نازل ہونے والی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی تلقین تھی کہ اگرچہ حب وطن ایمان ہے لیکن اسلامی ریاستوں سے محبت و ہمدردی کا تعلق نہ ٹوٹنے پائے۔ ہندوؤں نے بھی اسے تسلیم کیا اور عالی ظرفی سے ساتھ دیا۔ دونوں بچھڑے بھائی پھر مل گئے اور اخلاص و محبت سے رہنے لگے۔ نہ معلوم کس کی نظر لگ گئی کہ پھر پھوٹ پڑ گئی اور چار دن کی چاندنی کے بعد پھر اندھیرا گھپ ہوگیا۔ خدا ان بزرگوں کی ہمت میں برکت دے جو اب تک اس اتحاد کے پیدا کرنے میں سچے دل سے ساعی ہیں۔ اب ہندو اپنی تنظیم الگ کر رہے ہیں اور مسلمان الگ فکر میں ہیں کہ اپنی جمعیت درست کریں۔ بہر حال کچھ دنوں کے لئے یہ کھکھیڑ ان کی قسمت میں اور لکھی ہے۔ ٹھوکریں کھاکر ایک دن رستے پر آہی جائیں گے—

یہ سیاست دانوں اور ملک کے رہنماؤں کی تدبیریں تھیں۔ شاعر اور حکیم

کی صدا ان سے نرالی ہے- وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے وطنیت کا خیال ہیچ و پوچ ہے- سیاست ایک قسم کی عیاری ہے- تہذیب و آئین مغربی غول راہ ہے- اس لئے انہیں چاہئے کہ وہ ان پھندوں میں نہ پھنسیں وہ مذہب کو رشتۂ اتحاد بنائیں- وہ خصائل اور اخلاق پیدا کریں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھے اور ان اصولوں پر کاربند ہوں جو تیرہ صدی پہلے انہیں دئے گئے تھے اور اس پاک تعلیم کے زور ایشیا کی رہبری کریں اور پھر ایک بار عالم پر چھا جائیں کیونکہ دنیا کی نجات اسی میں ہے- یہ ہے اقبال کا پیام ملت اسلام کے نام اور سنہ ۱۹۰۵ ع کے بعد سے اس آواز میں زیادہ گونج اور قوت پیدا ہوتی جاتی ہے- یہ بہت اعلیٰ خیال ہے اور مسلمانوں کے لئے بہت خوش آیند ہے- لیکن ڈر ہے کہ اس خیال کی شدت کہیں ہمیں ہندوستان سے غافل نہ کر دے- ہندوستان کے مسلمانوں کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے جو دلی محبت ہے اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں- ہم اسے جنگ بلقان اور خلافت کے معاملے میں خوب دیکھ چکے ہیں- لیکن کیا ان کو بھی ہندی مسلمانوں سے ایسی ہی محبت ہے؟ ہندی ہر خطے میں حقیر سمجھا جاتا ہے اور غلام سے زیادہ اس کی وقعت نہیں- ہندی مسلمان کی خود اسلامی ممالک میں کوئی وقعت نہیں- جب تک ہم اس ملک میں جہاں رہتے ہیں اپنی حیثیت مضبوط نہ کرلیں اور جب تک ہم یہاں آزادی خیال اور آزادی عمل کو حاصل نہ کر لیں ملی اتحاد کا خیال خواب ہی خواب ہے- اگر مسلمان ملک کے دوسرے باشندوں کے دوش بدوش ملکی اتحاد و ترقی میں جد و جہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں تو انہیں اس ملک میں رہنے کا کیا حق ہے؟ وہ لوگ کیا دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں جو بے اجازت اپنے ملک سے قدم باہر نہیں رکھ سکتے اور جو بے اذن کسی عملی ہمدردی کے قابل نہیں ہیں؟ جب ہم اپنے ہی ملک میں بیگانہ اور آپس کے تفرقوں کے شکار ہیں تو دوسروں کے سامنے کس منہ سے اتحاد کی تعلیم پیش کریں —

تاہم اقبال کے پیام میں بلندی اور ایسا خلوص اور جوش ہے کہ وہ رائگاں نہیں جاسکتا- وہ سوتوں کو جگانے- غافلوں کو ہوشیار کرنے اور دلوں کے ابھارنے میں بجلی کا سا کام کریگا- اس کا مقصد سیاست یا ملک گیری نہیں بلکہ وہ اخلاقی اور روحانی پیام ہے جس کی بنیاد اسلامی تعلیم پر ہے اور جس کی غرض اسلامی اصول اور آئین کی اشاعت ہے جو اتحاد ملی کے ذریعہ سے دنیا پر کارفرمائی کر سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی انہیں اپنے " ترانۂ ہندی " کو بالکل بھلا نہیں دینا چاہئے —

وہ خود فرماتے ہیں --

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

مگر افسوس کہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا جاتا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں صرف عجمی خم اور حجازی بادہ ہی نہ رہ جائے اور اس خیال کی تصدیق مجھے اس شعر سے ہوئی جو بعد کا کہا ہوا ہے—

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہاے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

لیکن اگر ایسا ہوا تو غضب ہو جائے گا۔اس لئے ہم اس درخواست میں شیخ عبدالقادر صاحب کے ساتھہ شریک ہیں "کہ وہ اپنے دل و دماغ سے اردو کو وہ حصہ دیں جس کی وہ مستحق ہے- خود انہوں نے غالب کی تعریف میں چند بند لکھے ہیں جن میں ایک شعر میں اردو کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے—

گیسوے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سوداے دل سوزی پروانہ ہے

ہم ان کا یہ شعر پڑہ کر ان سے یہ کہتے ہیں کہ جس احساس نے یہ شعر ان سے نکلوایا تھا اس سے کام لے کر اب وہ پھر کچھہ عرصہ کے لئے گیسوے اردو کے سنوار نے کی طرف متوجہ ہوں" یہی نہیں کہ اردو ان کے خیالات سے محروم رہ جائے گی بلکہ ان کا پیام جسے وہ اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتے ہیں تشنہ اور اثر سے محروم رہ جائے گا—

اقبال کی شاعری یا ان کے پیام پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ ہمیں قدامت پرستی کی طرف مایل کرتی ہے اور بجاے آگے قدم بڑھانے کے وہ ہمں صدیوں پیچھے لے جانا چاہتی ہے-لیکن اس کی انہیں مطلق پرواہ نہیں بلکہ اس پر خوش ہیں اور ایک گونہ فخر کے ساتھہ خود ان الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں—

ہاں یہ سچ ہے-چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئنے میں فردا کو میں

لیکن ان کی قدامت پرستی مردہ نہیں ہے جو دلوں میں یاس اور اداسی پیدا کرتی ہے-بلکہ وہ ان اصول کی پیروی ہے جن کی صداقت پر شاعر کو کامل یقین ہے-وہ اپنے پیام میں عہد ماضی کی روشن مثال دکھاکر بار بار انہیں عمل اور جدوجہد اور ثبات پر آمادہ کرتا ہے—

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

اسی خیال کو دوسری جگہ ادا کیا ہے :—

اس رہ میں مقام بے محل ہے　　پوشیدہ قرار میں اجل ہے

یہی خیال اس شعر میں بھی ہے:—

مست مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو　　زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے

کوشش نا تمام کے متعلق کہتے ہیں :—

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ کام سے　　زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش نا تمام سے

اس سے بڑھ کر کوئی کیا کہہ سکتا ہے :—

وائے نادانی ! کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو۔ مینا بھی تو۔ ساقی بھی تو۔ محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیراللہ کو
خوف باطل کیا ؟ کہ ہے غارت‌گر باطل بھی تو
بے خبر ! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اقبال کی شاعری کی پوری حقیقت معلوم کرنے کے لئے شمع اور شاعر۔ خضرراہ اور طلوع اسلام کی نظمیں غور سے پڑھنی چاہئیں۔ یہ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی دوسری نظمیں اس پایہ کی نہیں ہیں۔ ان کی بعض چھوٹی نظمیں بہت پاکیزہ اور اعلے درجہ کی ہیں۔ مثلاً ایک آرزو۔ سرگزشت آدم۔ جگنو۔ چاند۔ صبح کا ستارہ۔ پرندہ اور جگنو وغیرہ بہت اچھی اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن جن تین نظموں کا میں نے نام لیا ہے وہ ایسی ہیں کہ ان میں اقبال کی شاعری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

تخیل کی بلندی۔ تشبیہات و استعارات۔ لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ اقبال کے کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔ وہ گویا مرزا کے معنوی شاگرد ہیں اور پڑھنے والا جسے ذوق سخن ہے باسانی اسے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بندش میں وہ چستی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مرزا کے طرز ادا میں جو خاص نزاکت ہے وہ نہیں پائی جاتی ہے اور نہ وہ سوز و گداز اور درد ہے جو ہم حالی کے کلام میں پاتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں تکلف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں مگر شان و شکوہ۔ زور اور شور امنڈتے ہیں۔ جذبات کی ادائی حکیمانہ نظر اور شاعرانہ انداز بیان میں اقبال کے کلام کا جواب نہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو—

آگ ہے - اولاد ابراہیم ہے - نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

گویا ہزارہا سال کے تاریخی تجربوں کے نچوڑ کو دو مصرعوں میں پیش کردیا ہے—

شاعروں نے بہار و خزاں کے سمے اور گل و بلبل کے راز و نیاز بیان کئے ہیں۔ اقبال نے صحرا کا سماں لکھا ہے۔ چند شعر ہیں مگر کس قدر بلند اور کیفیت پیدا کرنے والے:-

اے رہین خانہ تونے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضاے دشت میں بانگ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل
وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوے چشم جہاں بین خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل
تازہ ویرانے کی سوداے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

یا اس شعر کو دیکھئے - کیا خیال ہے اور کیا قوت بیاں:—

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہوکہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

میرا مقصد اس وقت اقبال کے منتخب اشعار کا پیش کرنا نہیں ہے اور نہ یہ اس کا موقع ہے اور نہ مسلسل نظموں میں سے بعض اشعار کا انتخاب مناسب ہے- جسے ان کے کلام کا لطف حاصل کرنا ہو وہ کم سے کم ان کی وہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں جن کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں—

آج کل بعض سخن سنج اقبال کے کلام کا مقابلہ ہندوستان کے ایک دوسرے نامور اور فخر ہندوستان شاعر ٹیگور کے کلام سے کرتے ہیں- ٹیگور کے کلام میں بیشک پریم کا رس گھلا ہوا ہے- اس کی محبت عالم گیر ہے- وہ تمام کائنات کو اپنے آغوش محبت میں اپنا چاہتا ہے- اس کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسکین اور روح میں سرور پیدا ہوتا ہے- لیکن اس میں وہ آگ نہیں جو اقبال میں ہے- ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن- ٹیگور کا جذبۂ محبت گو بہت

گہرا اور بے تھاہ ھے لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر کبھی آگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کیف و وجد کے آپے سے باھر نہیں ہونے پاتا۔اقبال کا مطمح نظر اگرچہ مقابلتاً محدود ھے مگر زیادہ قوی۔زیادہ پرزور اور زیادہ شور انگیز ھے۔ٹیگور کے ھاں نازک سے نازک موقع پربھی عقل کی پرچھائیں آس پاس ضرور نظر آتی ھے مگر یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض اوقات بیچاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لئے اچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ھے۔وھاں جذب و کیف کے ساتھ خود داری ھے اور یہاں وارفتگی و شیفتگی—

باھر کہاں اند کے آشفتگی خوش است
ھر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

لیکن اگر وہ ایک لحظہ کے لئے ذرا مڑ کر دیکھیں تو ھم انہیں ان کا "نیا شوالہ" دکھانا چاھتے ھیں جس کی قسمت میں تعمیر سے پہلے کھنڈر ہونا لکھا تھا۔گو اقبال اس وقت ایک دوسری شاندار تعمیر میں مصروف ھیں لیکن ایک روز انہیں ادھر آنا پڑیگا اور وہ ان کی شاعری کا تیسرا دور ہوگا—

دیوان حسرت

(حصۂ پنجم۔ششم۔ھفتم۔ھشتم۔نہم)

مولانا حسرت موھانی ھندوستان کے ان چند لوگوں میں سے ھیں جنہیں ملک کا ھر شخص جانتا اور بوجھتا ھے۔اگرچہ اس وقت ان کی سیاسی جدو جہد نے ان کی شاعری کو دبا لیا ھے لیکن آیندہ ان کی شاعری ھی ان کی بقا کا باعث ہوگی۔یہ پانچ دیوان جو مولانا نے ھمیں عنایت فرمائے ھیں ان میں کا اکثر حصہ زمانۂ قید یا زمانۂ گرفتاری کا لکھا ہوا ھے اور اس لئے اس کلام میں خاص لطف ھے۔اگر ھم اسے "زمزمۂ مرغ اسیر" کہیں تو بجا ھے۔حسرت اس وقت غزل گو شعرا میں اعلی درجہ رکھتے ھیں۔ان کے کلام کی پختگی صفائی اور شیرینی قابل تعریف ھے۔اگرچہ ان کی شاعری عاشقانہ ھے لیکن کبھی رکیک زبان یا خیال نام کو نہیں آتا۔انہوں نے غزل کا پایہ بلند کر دیا ھے اور اپنے خاص انداز میں سیاست کی چاشنی سے غزل کا لطف بڑھا دیا ھے۔حسرت نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی ھے اور باوجود سیاسی اور دیگر مشاغل کے وہ کبھی اس سے غافل نہ رھے۔باوجودیکہ ان کی شاعری کا دائرہ غزل کے حدود میں رہا لیکن انہوں نے صحیح ذوق پیدا کرنے میں بڑا کام کیا ھے۔جو لوگ شیریں اور بے عیب کلام اور پاک صاف اور شستہ زبان کے شائق ھیں وہ

حسرت کا کلام ضرور مطالعہ کریں—

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسین سخن کا
میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

حصۂ پنجم ہفتم اور نہم کی قیمت چار چار آنے - حصۂ ہشتم کی چھ آنے اور حصۂ ششم کی آٹھ آنے ہے- ''بیگم صاحب حسرت موہانی- حسرت روڈ- کان پور'' سے مل سکتے ہیں-

ارتنگ خیال

مولوی سید ضامن علی صاحب ضامن کنتوری کے دیوان کا پہلا حصہ ہے- جناب ضامن کہنہ مشق و پختہ گو شاعر ہیں اور قدیم طرز سخن میں بہت خوب کہتے ہیں- آپ کا کلام اردو کے اکثر رسائل میں مدتوں چھپتا رہا ہے اور کچھ زیادہ تعارف کا محتاج نہیں ہے- جناب ضامن مولانا حبیب کنتوری مرحوم کے خلف و تلمیذ رشید ہیں- آپ کے کلام میں پختگی اور کہنہ مشقی کے علاوہ قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ جدت مذاق بھی ایک حد تک نمایاں ہے- اس دیوان میں رسم قدیم کے موافق (۱۷۴) صفحہ تک ردیف وار غزلیں ہیں- اس کے بعد اور اصناف کلام کے نمونے نظر آتے ہیں- اس دیوان میں ایک جدت شعرا کے لئے قابل تقلید یہ ہے کہ ہر غزل پر سال تصنیف لکھ دیا ہے- اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کون غزل کس زمانے کی ہے- اگر تاریخ وار ہی ترتیب ہوتی تو بہت زیادہ بہتر ہوتا- اس سے یہ اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے کہ مشق سخن میں شاعر نے بتدریج کیا ترقی کی ہے اور کس زمانے میں مذاق سخن کیا اور مشق سخن کا عالم کیا تھا- ارباب دیوان یہ امر ملحوظ رکھیں تو یہ بہتر جدت ہوگی

جناب ضامن مرزا بیدل اور مرزا غالب کے اس رنگ میں کہنے کی زیادہ کوشش فرماتے ہیں جس کو مشکل پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے- چنانچہ اشعار غزل میں (حالانکہ ہمارے خیال سے صرف وہ زبان ہونا چاہئے جو میر اور سوز و درد نے اختیار کی ہے) ثقیل- غریب- مغلق الفاظ اور غیر مانوس ترکیبیں جا بجا نظر آتی ہیں اور بعض جگہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ ہی کے لئے شعر کہا گیا ہے نہ یہ کہ اپنے بلند پایہ خیالات کو ادا کرنے کے لئے شاعر یہ الفاظ لانے پر مجبور ہوا ہے- مثلاً فرماتے ہیں—

توہم فطرتی ہے وجہ غفلت ورنہ انساں کو
دل ہر ذرہ مجلاے شط نور یقیں ہوتا

اس میں شک نہیں کہ مقصود شاعر بہت خوب ہے- جو تعلیم وہ دے رہا ہے عین انسانیت کی تعلیم ہے مگر مغلق تراکیب و الفاظ نے مزہ کھو دیا- یا مثلاً —

جو ہوتا دل کو ذوق نغمۂ ساز حقیقت کچھ
طنین پشۂ کانوں کو سرور را مشیں ہوتا

یا
دکھائیں وہم نے کیا کیا ڈراؤنی شکلیں
خیال غیر کا پتیارۂ مہیب ہوا

یا
وہ تمثال فنا ہوں صفحۂ ارتنگ ہستی پر
کہ مجھ سے پہلے اڑ جانے کو ہے رنگ اثر میرا

جوشش رحمت حق دیکھئے کیا کرتی ہے
ابر بن کر تتق حسرت سائل ہوگا

اسی طرح " پتیارۂ مہیب " " صفحۂ ارتنگ ہستی " " تتق حسرت سائل " کی ترکیبیں اگرچہ صحیح ہیں مگر خوشگوار۔مانوس اور فصیح یقیناً نہیں ہیں۔اس غرابت و ثقالت سے قطع نظر کیجیے تو اکثر غزلوں میں بہت عمدہ عمدہ اشعار ملتے ہیں۔مثلاً

چارہ جب ہو نہ سکا عقل کی بیماری کا
نام رکھا گیا تقدیر خطا کاری کا

اور بھی ایسے اشعار ہیں جن میں زمانے کو بہترین تعلیم عمل دی ہے اور یہ درس کنایات میں بہت خوب کام کرتا ہے۔ضامن صاحب اور فرماتے ہیں—

کوشش سے بن ہی جائے گی کوئی نہ کوئی شکل
یہ مدعا ہے گردش چاک کلال کا

ذیل کی غزل نہایت پاکیزہ و دلکش ہے۔اس کا مزہ ہم تقریباً سولہ سترہ برس سے لے رہے ہیں جب کہ یہ مرحوم اردوے معلی علی گڈہ کے اپریل نمبر سنہ ۱۹۰۷ ع میں شایع ہوئی تھی۔فرماتے ہیں—

سودائے زلف ضامن بھر خدا نہ کرنا
سر پر بلا نہ لینا دل پر جفا نہ کرنا
بیتابیے محبت اک شعبۂ جنوں ہے
میرے کہے سنے پر تم اعتنا نہ کرنا
رنگ پریدۂ رخ تفسیر بے دلی ہے
عرض نیاز الفت اس کے سوا نہ کرنا
جیتے ہیں جینے والے مرتے ہیں مرنے والے
عاشق کے غم میں دیکھو تم زلف وا نہ کرنا

اس غزل کے تقریباً تمام شعر بہت خوب ہیں اور ایک شعر سنیے—

دیتا ھے دل کو لطف نوا ھاے راز کا
نغمہ صریر خامۂ معنئے طراز کا
کچھہ اور بڑہ گئی ھیں ادھر بے نیازیاں
الٹا اثر پڑا یہ فسون نیاز کا
ایک عرصۂ دراز سے وہ سنگ آستاں
ھے سجدہ گاہ میری جبین نیاز کا

عرصۂ دراز کی ترکیب کے جواز میں شک ھے کیونکہ عرصہ بہ معنئے مدت فارسی کلام میں نظر سے نہیں گزرا-شاید جناب ضامن کوئی سند رکھتے ھوں شعر بہت پاکیزہ ھے —

سر مست تماشا ھوں وہ جلوہ مقابل ھے
لبریز مئے حیرت مینا کدۂ دل ھے

جناب ضامن کا کلام پختگی کے علاوہ زبان و فن کے اغلاط سے پاک ھے-یہ سب سے بڑی خوبی ھے جس کی اس ھڑ بونگ کے زمانے میں بہت کم امید کی جا سکتی ھے-کہیں کہیں بہ تقاضاے بشریت کچھہ سقم نظر آتے ھیں-مگر وہ چنداں قابل گرفت نہیں مثلاً

ھمیشہ جام تھا اس خمکدے میں اپنا تہی
سرور ھی نہیں آیا خمار کیا ھوگا

مصرعۂ اولی میں ھمیشہ جام تھا-خلاف محاورہ اھل زبان ھے ایسے موقع پر-ھمیشہ سے تھا یا ھمیشہ رھا بولتے ھیں-اس خیال کے صحیح ھونے کا بڑا ثبوت یہ اصول ھے کہ نظم کو نثر کر کے دیکھہ لیا جائے تو فوراً پتہ چل جاتا ھے-ایک اور شعر ھے

چشم ظاھر بیں ھے کیا مسحور افسون نمود
دوسرا رخ تو کوئی دیکھے کبھی تصویر کا

پہلے مصرعہ میں یہ معنوی سقم معلوم ھوتا ھے کہ جب مسحور کا لفظ موجود ھے تو افسون کا لفظ زائد اور حشو ھوگا-مسحور نمود کہنا کافی تھا کیونکہ افسون کے معنئے لفظ مسحور میں خود موجود ھیں—

کس قدر ھے مری جانب سے کدورت یا رب
اشک بھی ان کے تصور میں مکدر نکلا

آنسو اور اشک کا صیغۂ واحد کے ساتھہ استعمال جو-ایک اور ھر کے ساتھہ ھوتا ھے-ورنہ جمع ھی بولتے ھیں-یہی اچھا معلوم ھوتا ھے—

جیسے جو اشک آنکھوں سے آتا ھے سو بیتابانہ آتا ھے
گر کے دامن پر بنا ھر اشک تصویر بہار

یا (فقرہ) اس کی آنکھہ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا-ان تین صورتوں کے علاوہ

اشک اور آنسو جہاں تک خیال ھے بہ صورت جمع ھی مستعمل ھوتے ھیں—

موج بال افشانیے بلبل ھے طغرائے بہار
ھونے دیجے گل کہاں تک خود نما ھو جائے گا

یہ ردیف یہاں ٹھیک نہیں ھے-خود نما ھوگا یا خود نما ھوتا ھے-محل و مقام کے لحاظ سے چاھئے-ھونے دو گل کہاں تک خود نما ھوگا یا ھونے دو (دیکھیں) گل کہاں تک خود نما ھوتا ھے—

ٹپکا پسینہ ان کے رخ بے مثال کا
لبریز تھا چھلک گیا ساغر جمال کا

یہ مطلع بہت خوب ھے-مگر میرے نزدیک ایک یہ معنوی سقم ھے کہ وہ ساغر جو بادۂ جمال سے لبریز تھا چھلک گیا تو یقیناً حسن رخ دوست کچھہ کم ھو گیا ھوگا- کیونکہ ساغر جمال (رخ محبوب) سے شراب حسن چھلکتی ھے-حالانکہ یہ خلاف حقیقت ھے- پسینہ ٹپکنے سے حسن میں کوئی کمی نہیں آتی اور نہ اسے ساغر جمال کا بادہ کہہ سکتے ھیں—

بعض بعض جگہ ایسے الفاظ بھی استعمال میں آگئے ھیں جو متروک سمجھے جاتے ھیں-ھم خوش ھیں کہ ضامن صاحب نے اس کی پروا نہیں کی اور بلا تکلف ایسے الفاظ استعمال کئے ھیں-شاعر کو اس کا حق ھے البتہ یہ ضرور ھے کہ استعمال موقع و محل سے ھو اور حسن کے ساتھہ ھو-ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے قطع نظر کریں تو یقیناً بہت سے عمدہ عمدہ شعر دیوان میں ملتے ھیں-غزلوں کے بعد صفحہ ۱۷۵ کے بعد سے ۲۵ صفحوں میں مسمطات یعنی دیگر اصناف سخن:-ترتیب بند-ترجیع بند وغیرہ ھیں-پھر قطعات اور جدید طرز کی نظمیں ھیں-مثلاً دل گم گشتہ کی یاد- پھر مجھہ کو ھنسنا چاھئے-نقش قدم-گرد باد-حسین ساگر وغیرہ چند تقریظات تقریباً سو رباعیات پر قطعات تاریخ ھیں-اس طرح یہ دیوان ۲۴۶ صفحات پر ختم ھوتا ھے-لکھائی چھپائی صاف مگر کاغذ بہت معمولی ھے-قیمت قسم اول تین روپیہ قسم دوم دو روپیہ ھے زیر تبصرہ دیوان غالباً قسم دوم کا ھوگا-سر ورق خوش نما رنگین—

جناب مصنف سے گورنمنٹ سنٹرل پریس حیدرآباد-دکن کے پتے پر منگوائیے-

(م)

تسخیر فرانس

تفضل حسین صاحب ناظر نے شکسپیر کے مشہور تاریخی ناٹک ہنری دی ففتھہ کا

ترجمه اس نام سے کیا ھے-ان نام نہاد ترجموں سے اگر قطع نظر کرلی جائے جو خون ناحق- اسیر حرص-حبشی غلام وغیرہ کے ناموں سے ھمارے ناٹک کو بدنام اور شکسپیر کے خیالات کو مسخ کرتے ھیں تو یہ چیز اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی ادبی خدمت کہی جاسکتی ھے اور اس لحاظ سے قابل قدر ھے-اسی قسم کی کوششوں میں ھمارے ڈرامہ کی آیندہ ترقی مضمر ھے—

ترجمه کو جسته جسته پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے که قابل مترجم نے اصل عبارت کی پابندی نہیں کی ھے-جہاں لفظی ترجمه سے اصلی زور کلام باقی نه رهتا هو وهاں یه طریقه بہت مناسب ھے-اس پایه کے ناٹکوں کے ترجموں میں بڑی چیز یه ھے که الفاظ بے روح نه هوجائیں-بلکه اصلی مفہوم کو پورے زور کے ساتھه ادا کریں-اسی لئے موجودہ آزادانه ترجمه پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا پھر بھی بعض مقامات پر ترجمه نه صرف اصلی الفاظ بلکه اصلی مطلب سے الگ جا پڑا ھے اور یه چیز کسی قدر اصلاح طلب ھے-هم اس کی بعض فروگزاشتوں پر اس امید پر تبصرہ کرتے ھیں که آیندہ اشاعتوں میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا-

---

(صفحه ۱۱) بادشاہ ھنری-"تو کیا ھم حق حق اور راست راست فرانس کا دعوی کرسکتے ھیں ؟" یه ترجمه کسی قدر بھونڈا ھو گیا ھے-انگریزی الفاظ With right and conscience کا مفہوم اس طرح بھی ادا ھو سکتا ھے "که صداقت اور ضمیر کو ھاتھه سے دئے بغیر"-اسی صفحه پر Warlike spirit کا ترجمه "روح پر فتوح" کیا گیا ھے-جنگ کے موقع کو مد نظر رکھتے ھوئے "نبرد آزما" کا لفظ زیادہ موزوں ھوتا—

(صفحه۱۲) "مغرور فرانسیسیوں کی ناک زمیں پر رگڑ دی"-ناک رگڑنا فعل لازم ھے اور عاجزی کرنے کے معنوں میں آتا ھے-سمجھه میں نہیں آتا که اسے متعدی شکل میں کیونکر استعمال کیا گیا-اور پھر اس جملے کا That could entertain the full pride of France ترجمه تو یه ھو ھی نہیں سکتا-اس کا سیدھا سادھا ترجمه تو یه ھے که "فرانس کی چیدہ فوجوں کو مصروف بکار رکھا"—

(صفحه ۱۳) پر Pilfering کے معنی "ذلیل" دیے ھیں-سرحدیوں کی لوٹ مار کے لئے تو "اچکے" زیادہ اچھا ھوتا—

(صفحه ۱۳) "اڈورڈ کی شہرت کا ڈنکه ساری دنیا میں بج گیا" اصل میں الفاظ Prisoner kings زیادہ ھیں جس کا مفہوم بادشه گیری-یا بادشاھوں کو گرفتار کرنا ھے-یه مفہوم اس ترجمه میں بالکل نہیں پایا جاتا—

(صفحه ۱۴) اگزیٹر کی تقریر کا آخری حصه "مثل موسیقی کے ....الخ"

اصل سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ساز کے مختلف راگوں کی ہم آہنگی کی طرف جو اشارہ اصل میں ہے اس کا لطف ترجمہ میں نہیں ہے —

(صفحہ ۱۸) "قاعدہ کلیہ ہے کہ جب انسان رہتا ہے" ترجمہ کے علاوہ مفہوم بھی غلط ہے۔اصل کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب "گھر سے باہر رہتا ہے تو بہت زیادہ خوش رہتا ہے" —

(صفحہ ۱۸) "جن کی آتش باری تیری روح رہے گی" اصل کا مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں سے جو انتقام کا کام لیا جائیگا اور جس سے کشت و خون ہوگا۔اس کا بار تیری روح پر رہے گا" —

(صفحہ ۷۲) پر پسٹل اور بادشاہ کی گفتگو کو تقریباً مسخ کر دیا ہے۔ پسٹل مسخرہ ہے۔ لیکن شکسپیر کے مسخرے ہمارے یہاں کے ناٹک کے مسخروں کی طرح نہیں ہوتے۔ خدا معلوم مترجم صاحب نے پسٹل کی گفتگو کو خواہ مخواہ قافیہ کا پابند کیوں بنا دیا ہے۔کیا جس حالت میں پسٹل تھا اس حالت میں مقفیٰ گفتگو کی جاتی ہے ؟ پسٹل کی گفتگو کا ترجمہ جہاں کہیں بھی ہے۔بہت کم صحیح ہے۔ہم مانتے ہیں کہ انگریزی عامیانہ زبان کا اپنی عامیانہ زبان میں ترجمہ بہت مشکل ہے۔ لیکن اس سے کیا فائدہ کہ بجائے حقیقی کے اسے مصنوعی اور مہمل بنا دیا جائے —

(صفحہ ۷۳) پر ان جملوں کا " بادشاہ تو میاں مٹھو ہے۔ملکہ مرغ زرین۔ نجیب الطرفین۔ بلکہ ذوقافیتین۔ نعلین در بغلین " اگر اصلی عبارت سے مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ وفاداری کا رنگ جو اصل میں جھلکتا ہے ترجمہ سے بالکل اڑ گیا ہے۔اور اس کی جگہ بے تکا پن اور بیہودہ "ٹھٹھول" نظر آتا ہے —

(صفحہ ۷۶) Children rawly left. کا صحیح ترجمہ بال بچوں کا کچا ساتھ ہے۔ "بیکسی" میں وہ مفہوم نہیں باقی رہتا اسی صفحہ پر بادشاہ کی گفتگو میں اس جملے سے "ان کو تو اپنے کام سے غرض ہے۔ان کے مرنے سے مطلب نہیں" بجائے اس کے کہ بادشاہ آقا اور باپ بری الذمہ قرار پائیں الٹا ان ھی پر الزام عائد ہوتا ہے۔حالانکہ اصل کا ترجمہ یہ ہے "کہ ان کی نیت کام کرانے کی ضرور ہوتی ہے۔نہ یہ کہ یہ بچارے مر جائیں" ترجمہ سے اس کا مقابلہ کیجئے تو اس کا بالکل برعکس نظر آتا ہے —

(صفحہ ۷۱) "میں اور کفارہ بھی دوں گا۔ لیکن میں کیا اور میرا کفارہ کیا۔ما میں تو بس تیری رحمت کا محتاج ہوں" اس ترجمہ کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے " میں اس سے زیادہ بھی کرنے کو تیار ہوں حالانکہ جو کچھ بھی میں کروں وہ اس وجہ سے کم حقیقت ہے کہ ان سب سے کہیں زیادہ خود میری پشیمانی اور توبہ ہے جو تجھ سے رحمت طلب ہے —

(صفحہ ۷۲) ڈافن کی گفتگو " ان کا گرم گرم لہو اچھل کر دشمنوں کی آنکھیں

پھوڑ دے اور ان کے پتے پانی ہوکر آنکھوں کی راہ بہہ جائیں"- فرا ترجمہ ہے- اصل کا مفہوم ہی غائب ہے- انگریزی عبارت یہ ہے—

That thier hot blood may spin in English eyes,
And dout them with superfluous courage.

یہ طنز ہے اور اس طنز کی جان Superfluous courage ہے- کانسٹبل نے کہا کہ ہمارے گھوڑے شوق جنگ میں ہنہنا رہے ہیں- ڈافن کہتا ہے کہ ان کے پہلوؤں میں مہمیز بھونک دو تاکہ ان کا زائد از ضرورت جوش خون کی شکل میں اچھل کر انگریزوں کی آنکھوں میں پڑے- مطلب یہ ہے کہ فرانسیسی گھوڑوں میں بھی اتنا جوش ہے کہ وہ کچھہ انگریزی سپاہیوں کو مستعار دے سکتے ہیں- اگر مترجم صاحب "فاضل جوش" کا لفظ بھی بڑھادیتے تو مفہوم اصل سے زیادہ قریب ہوجاتا—

(صفحہ ۸۳) Carrions کا ترجمہ "مرداروں" کچھہ اچھا نہیں معلوم ہوتا "لاشوں" اس سے غنیمت ہوتا- فلولین کی گفتگو میں ہمیشہ ب کو پ سے بدل دیا ہے جو بجاے اس کے کہ اس کی گفتگو کا صحیح اندازہ دلا سکے عبارت کو مضحک بنا دیتا ہے اصل میں فلولین کہیں- b کہتا ہے- کہیں- p - ترجمہ میں اس پابندی کی کیا ضرورت تھی- دھاتی یا گنواری زبان زیادہ مناسب ہوتی- عامیانہ انگریزی زبان کا بہترین ترجمہ میرے خیال میں مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اپنے "فسانۂ لندن" میں کیا ہے- وتنگھم کی گفتگو پڑھی جائے تو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے- بجاے اس کے کہ اس قسم کی تقریروں کو مسخ کیا جائے مناسب یہ ہے کہ اپنے یہاں کے اسی طبقہ کی زبان استعمال کی جائے- اس سے ترجمہ مضحک نہیں ہوتا اور لطف باقی رہتا ہے—

آخر میں اس قدر اور کہنا ہے کہ ترجمہ ضرورت سے زیادہ آزادانہ ہے- ہم یہ نہیں چاہتے کہ بالکل لفظی ہو- لیکن ایسے کلام کے ترجمہ میں جو کلاسکل ہے جتنے لفظ بھی استعمال کئے جائیں چن چن کر بٹھائے جائیں کیونکہ تقریر کے الفاظ ہی ڈرامے کی جان ہوتے ہیں- انہیں صحیح معنوں میں بولنے والے کے جذبات کی تصویر ہونا چاہئے—

ترجمہ ان خامیوں کے باوجود قابل قدر ہے اور نقش اول ہونے کی حثیت سے بہت اچھا ہے— (و)

مکاتیب امیر مینائی

منشی مفتی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم اس زمانے کے بہت اچھے اور مستند شعرا میں سے تھے- بعض کے نزدیک وہ متاخرین میں سب سے بہتر شاعر خیال

کئے جاتے ہیں۔مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اخلاق و عادات میں اسلاف کا نمونہ اور شعر و شاعری میں قدما کی یادگار تھے۔پہلی بات پر ان کے خطوط اور دوسری پر ان کی اصلاح سخن شاہد ہے—

منشی صاحب مرحوم کے رشید اور عزیز شاگرد مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب (مدیر رسالۂ قند پارسی و پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار) نے بڑی تلاش اور کوشش سے منشی صاحب مرحوم کے خطوط جمع کر کے پہلی بار سنہ ۱۹۱۰ ع میں شایع کئے اور اب دوسرے بار یہ مجموعہ اضافے اور ترمیم کے ساتھہ شایع کیا گیا ہے—

شروع میں حضرت امیر کے حالات۔وضع و اخلاق و عادات اور تصانیف و تالیفات کا کسی قدر مفصل ذکر ہے۔اس کے بعد چند خوش فکر تلامذہ کا ذکر اور ان کے کلام کی وقتاً فوقتاً جو اصلاح کی ہے اس کے نمونے دئے ہیں۔بعض بعض مقامات پر مرحوم نے اصلاح کی وجہ بھی بتا دی ہے۔یہ اصلاحیں پر لطف ہیں اور ان سے ایک حد تک بصیرت ہوتی ہے۔یہ اصلاحیں صرف زبان کی حد تک ہوتی ہیں۔نفس شاعری سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اسی دیباچے میں انہوں نے امیر کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جو بلا شبہ منصفانہ اور ایک حد تک بے لاگ ہے جس کی توقع ان کے کسی شاگرد سے نہیں ہو سکتی۔ اسی میں داغ و امیر پر بھی محاکمہ فرمایا ہے۔ان دونوں با کمال استادوں کی زندگی ھی میں دو جتھے بن گئے تھے اور اس کا چرچا اب تک چلا آرہا ہے۔اس لئے ممکن نہ تھا کہ حضرت ثاقب اس سے بچتے۔اس تبصرے اور محاکمے کا خلاصہ یہ ہے—

"حضرت کی طبیعت میں جدت کم ہے اور کلام میں سوز و گداز بھی۔البتہ شکوہ الفاظ۔متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔وہ اصناف سخن پر قادر اور استاد ماہر ہیں۔قصائد با شوکت وفر کہتے ہیں اور سخنور با سرمایہ۔صاحب علم و فضل ہیں۔داغ ان اوصاف سے معرا ہیں—

"آخر عمر میں استاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھہ کر زبان کی صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے۔تاہم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہیں پہنچی۔ واقعی بات یہ ہے کہ امیر کی استادی میں کلام نہیں کر سکتا۔لیکن اسیر کا تلمذ۔اساتذۂ لکھنؤ کی ہم بزمی۔اہل لکھنؤ کے کلام کا پیش نظر رہنا۔پھر لکھنؤ کی صحبت کا اثر۔یہ سب امور مانع ترقی و کامیابی ہوئے۔اگر وہ دلی میں پیدا ہوتے۔دلی کے ارباب کمال کی ہم نشینی میسر آتی۔اساتذۂ دہلی کا کلام سامنے رہتا اور شاہجہاں آباد کی سوسائٹی سے مستفید ہوتے تو وہ سخنور بے مانند اور استاد ارجمند ہوتے—

"مرزا داغ مرحوم کی شوخ طبیعت نے ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کو غزل کی

جان اور اردو شاعری کی روح و رواں کہنا سراسر انصاف ہے۔مذاق عام نے اس رنگ سے اپنے آپ کو خوب رنگا اور ہر طرف سے اس پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے—

"اعلیٰ جذبات اور خیالات سے استاد امیر کا کلام مالامال ہے۔بر خلاف اس کے ادنیٰ جذبات اور خیالات مرزا داغ کی شاعری کا سرمایہ ہے۔داغ نے عشق سے مراد ہوسناکی اور نفس پرستی لی ہے اس لئے ان کی شاعری مہیج جذبات عالیہ نہیں ہے۔ جذبات عالیہ کا تعلق حسن و عشق سے ہے اور داغ کے اشعار خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی سے لبریز ہیں۔مرزا کی شاعری ادنیٰ ہے۔البتہ زبان ان کے مضمون کے لئے جان ہے۔زبان کی بے تکلفی اور شوخی عیاشانہ ان کی شراب کو دو آتشہ کر دیتی ہے"—

اس محاکمہ میں ایک بات یہ کہی ہے جو عام طور پر اکثر سخن سنج اصحاب فرمایا کرتے ہیں کہ داغ کا علمی سرمایہ کچھ نہ تھا۔اس کا جواب مولانا شبلی مرحوم نے بہت خوب دیا ہے۔ان کے الفاظ یہ ہیں—

"اہل عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا۔یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔فارسی میں دیکھئے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی۔انوری اور نظامی کے مقابلے میں جاہل تھا۔تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں "کہ آراست زلف سخن چوں عروس"۔جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھ کر ہیں۔غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں"—

اب رہے شاعری کے دوسرے کمال۔سو اس کی نسبت میری یہ عرض ہے کہ اعلیٰ جذبات اور خیالات نہ امیر میں ہیں نہ داغ میں۔سوز و گداز سے بھی دونوں کا کلام خالی ہے۔حضرت ثاقب نے جو یہ فرمایا ہے کہ "اعلیٰ جذبات اور خیالات سے استاد امیر کا کلام مالامال ہے"۔یہ محض شکوہ الفاظ کا فریب اور لفظی ترکیبوں کی نمود ہے۔اس میں بعض اوقات اچھے اچھے مبصروں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔البتہ زبان کی صفائی۔محاورات کا بے تکلف استعمال۔بیان کی شوخی اور طرز ادا کا بانکپن۔یہ ایسی چیزیں ہیں جو داغ کو اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی—

اس کے ساتھ فاضل مولف و مرتب نے داغ و امیر کا کلام بالمقابل دیا ہے۔نظم کے انتخاب کے بعد امیر مرحوم کے نثر کے نمونے بھی دئے ہیں۔یہ کل حالات اور تبصرے وغیرہ ۱۰۶ صفحے پر آئے ہیں۔اس کے بعد مکتوبات ہیں—

خطوط جو بے تکلف دوستوں اور عزیزوں کو لکھے جاتے ہیں وہ لکھنے والے کے خیالات و جذبات کا آئنہ ہوتے ہیں اور جو باتیں ہمیں کاتب کے متعلق ان تحریروں

میں مل جاتی ہیں وہ اس کی تالیف و تصنیف میں نہیں ملتیں۔اس کی سیرت کا صحیح اندازہ اکثر ان خطوط سے ہوتا ہے۔ان میں وہ اوروں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اپنے سے باتیں کرتا ہے اور اس لئے حجاب اور راز دلی خیالات اور جذبات کے اظہار میں مانع نہیں ہوتے۔اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں حضرت امیر مرحوم کے خطوط پڑھ کے بہت مایوسی ہوئی۔تقریباً تمام خطوط بے لطف۔بے مزہ اور روکھے پھیکے ہیں۔ہم نے یہ خیال کر کے کہ ایک باکمال استاد کے خطوط ہیں اور اس میں کیسے کیسے جواہر ریزے ہوں گے اول سے آخر تک تمام خطوط پڑھے لیکن ان میں نہ تو زبان کا لطف ہے نہ طرز بیان کی کوئی خوبی ہے۔نہ کہیں ادبی نکات بیان فرماتے ہیں اور نہ کہیں شعر و سخن پر کوئی ایسا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ پڑھنے والے کو بصیرت ہو اور نہ کوئی ایسی بات ہے کہ جس سے واقعات و حالات زمانہ پر کسی پہلو سے روشنی پڑے۔ ہر خط میں آلام و امراض گوناگوں کا رونا اور قلت فرصت کا شکوہ ہے یا پیام و سلام اور خیر و عافیت یا روز مرہ کی بہت معمولی باتیں ہیں۔بیان کرنے والے انہیں باتوں کو بعض اوقات اس طرح بیان کرجاتے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر دل مزے لینے لگتا ہے مگر یہاں یہ بھی نہیں۔بعض خط ایسے ضرور ہیں کہ ان میں استفسار پر بعض الفاظ اور محاورات کی صحت اور غلطی پر بحث کی ہے لیکن وہ بھی معمولی باتیں ہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جس میں کوئی خصوصیت یا جدت یا خاص تحقیق ہو۔لوگ اپنے بزرگوں اور استادوں کی ہر چیز کو مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں۔عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کردیتی ہے۔تنقید اپنی نظر نیچی کر لیتی ہے اور انصاف ادھر منہ پھیر لیتا ہے۔جو صاحب آئندہ ایسا کام کرنا چاہتے ہیں انہیں بہت دیکھ بھال کے بعد ہاتھ ڈالنا چاہئے اور ملک کے سامنے ایسی چیزیں پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہئے جو فضول اور بیکار ہوں—

البتہ ان خطوط سے دو باتیں ضرور معلوم ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ ان کے شاگردوں کا سلسلہ بہت وسیع تھا اور ان سے منشی صاحب مرحوم کو دلی تعلق تھا اور بعض بعض شاگردوں کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ان کی خوشی سے خوش ہوتے اور ان کے دکھ سے انہیں دکھ ہوتا۔دوسرے امیر اللغات کی تالیف میں بڑا انہماک تھا۔مگر افسوس کہ کافی امداد بہم نہ پہنچنے سے اس کی تکمیل کی حسرت ان کے دل میں رہ گئی—

ان خطوط سے کہیں زیادہ مفید وہ حصہ ہے جو حضرت ثاقب نے ابتدا میں منشی صاحب مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کے تبصرہ وغیرہ پر لکھا ہے۔اس سے ہمارے قدیم شعرا کے خیالات۔ان کی صحبتوں۔شاگردوں سے ان کے تعلقات۔ان کی شاعری اور اصلاح کے طریقوں سے آگاہی ہوتی ہے۔کیونکہ یہ رسمیں اور طریقے اب اٹھتے جاتے ہیں اور آئندہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب ان چیزوں کی تلاش ہو گی—

کتاب کے کل صفحے ۴۰۴ ہیں- کاغذ- لکھائی- چھپائی بہت معمولی- ۵۱ ئرۂ ادبیہ لکھنؤ سے دو روپیہ آٹھ آنے میں مل سکتی ھے —

خواجہ حسن نظامی صاحب کی جدید تالیفات

خواجہ صاحب بھی اس زمانے کے عجائبات میں سے ہیں- ایک طرف تو وہ شیخ اور صوفی ہیں اور بقول خود ساتھہ پینستھہ هزار مریدوں کے مرشد و رهنما ہیں- دوسری طرف وہ مولف و مصنف بھی ہیں اور مصنف بھی معمولی نہیں- ایسے پرنویس ہیں کہ روزانہ ایک کتاب لکھہ ڈالتے ہیں اور وہ بھی کسی ایک مضمون پر نہیں بلکہ ان کا قلم هر علم و فن میں رواں ھے- پرنویسی اور پر گوئی ایک عیب سمجھا جاتا ھے مگر خواجہ صاحب کے هاں هنر هوگیا ھے- ان دو حیثیتوں کے ساتھہ انہوں نے دو شاخیں اور بھی قائم کی ہیں- ایک حکمت اور دوسری تبلیغ- دعا کے ساتھہ دوا کا کچھہ برا جوڑ نہیں- رهی تبلیغ سو وہ بحیثیت مشایخ کے ان کا فرض ھے- غرض خواجہ صاحب میں جدت- مستعدی- پرنویسی- زمانہ شناسی کی ایسی صفات موجود ہیں جو شہرت و کامیابی کی ممد و معاون ہیں- لوگ کہتے ہیں کہ ان کا علم گہرا نہیں- لیکن معترض یہ نہیں سمجھتے کہ علم کی گہرائی ہمیشہ کارآمد نہیں هوتی- دوسرے بڑا نقص اس میں یہ ھے کہ علم کی گہرائی آدمی کو بزدل بنا دیتی ھے اس میں جرأت نہیں رهتی اور ایک قسم کا حجاب پیدا کردیتی ھے- اگر خدانخواستہ خواجہ صاحب کا علم بھی ایساهی گہرا هوتا جیسے بعض لوگ قابل تعریف سمجھتے ہیں تو نوبنو مضمونوں- اشتہاروں اور کتابوں کی بارش جو ان کے رین بسیرے سے هوتی ھے کہاں هوتی اور لوگ اس فیض سے محروم هی رہ جاتے- بعض کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب محقق نہیں- معلوم نہیں تحقیق سے ان صاحبوں کا کیا مطلب ھے- یہی نہ کہ سالہاسال کسی چیز کی کرید اور چھان بین میں رهے اور ایک عمر کے بعد گوهر مقصود هاتھہ لگا- خدا نہ کرے خواجہ صاحب اس خبط میں مبتلا هوں- یہ سست اور کاهل لوگوں کا کام ھے- ان کی ذات اس سے بہت ارفع ھے- چشم بد دور ان کی طبیعت میں وہ جدت اور جولانی ھے کہ هر روز نئی تحقیق فرماتے اور نئی بات نکالتے ہیں- یہ تمام اعتراضات خواجہ صاحب کی جدت آفرین طبیعت کے سامنے هیچ و پوچ ہیں- اب هم ان کتابوں پر جو حال هی میں خواجہ صاحب نے شایع فرمائی ہیں اور همارے پاس بغرض تبصرہ آئی ہیں نظر ڈالتے ہیں —

اسلامی رسول

یہ کتاب اس سلسلہ کی ھے جو خواجہ صاحب نے داعیان اسلام کی تعلیم اور

انسداد ارتداد کے لئے شایع کرنا شروع کیا ھے- یہ کوی ۳۶ صفحے کی کتاب ھے اور اس میں آن حضرت صلعم کے اخلاق و سیرت کو مختصر طور پر بیان کیا ھے- قیمت ڈھائی آنہ

پنواڑی کی دکان

یہ کتاب بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ھے- بظاہر اس کتاب کا کوئی تعلق اس سلسلے سے نہیں معلوم ھوتا- لیکن یہی وہ بات ھے کہ میں کہتا ھوں کہ خواجہ صاحب کی طبیعت میں خاص جدت ھے- اس کا مقصد یہ ھے کہ بے روزگار مسلمان روزي سے لگ جائیں- روزی سے لگ جانا استحکام ایمان کی دلیل ھے- کیونکہ جو مفلس اور بے روزگار اور مقروض ھے اس کا ایمان ڈانواں ڈول رھتا ھے اور وہ افلاس سے تنگ آکر دوسروں کے ھاتھہ میں پھنس جاتا ھے اور دین و ایمان بیچ دیتا ھے- اگرچہ خواجہ صاحب پنواڑی نہیں مگر وہ وہ پتہ کی باتیں لکھی ھیں کہ پنواڑي مسخرا کیا لکھے گا- غرض کوی بات اس دکان کے متعلق نہیں چھوٹی اور ذرا ذراسی باتیں اس تفصیل سے لکھی ھیں کہ خواجہ صاحب کی ذھانت اور مشاھدہ کی داد دینی پڑتی ھے- آخر میں نئي قسم کے اشتہاروں اور خاص کر صداؤں کے جو نمونے دئے ھیں وہ بہت دلچسپ ھیں- بے کار و بے روزگار لوگوں کے پڑھنے کے قابل ھے- اس سے قبل خواجہ صاحب نے مسلمانوں کو صاحب لوگوں کی خانساماں گري کی ھدایت فرمائی تھی اور اس شریف پیشے کے گونا گوں فوائد سے انہیں آگاہ کیا تھا- مگر یہ بدنصیب قوم اپنے سچے ھوا خواھوں کی نصیحت پر بہت کم عمل کرتی ھے- امید ھے کہ اب وہ ایسی غلطی نہ کریں گے اور جس دلسوزي سے خواجہ صاحب نے یہ مشورہ دیا ھے اسی مستعدي سے وہ اس پر عمل کر کے دکھا دیں گے- کتاب دلچسپ اور مفید ھے- قیمت تین آنہ

تاکید نماز

یہ بھی اسی سلسلے کی کتاب ھے- اس میں نماز پڑھنے کی تاکید اور اس کے فوائد بتائے ھیں- خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ آریہ ھمارے بھائیوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے بے دین بنا رھے ھیں- اس لئے انہوں نے مسلمانوں کی جہالت رفع کرنے کے لئے اس قسم کے رسالے لکھنے شروع کئے ھیں- قیمت تین آنہ

ھندو مذھب کی معلومات

اس کتاب کے ابتدائی چند صفحوں میں ھندو مذھب کے خاص الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح کی ھے- اس کے بعد ھندو مذھب کے مختلف فرقوں کا مختصر حال لکھا ھے- یہ

بالکل ابتدائی کتاب ہے اور جو لوگ ہندو فرقوں اور ان کے مذہب اور ذات سے بالکل نا واقف ہیں ان کے لئے بہت اچھی ہے۔ ایک بڑی خوبی اس کتاب میں یہ ہے کہ اس کے لکھنے میں خواجہ صاحب نے بہت انصاف اور بے تعصبی سے کام لیا ہے۔ مجھے اس کا بہت کھٹکا تھا۔لیکن کتاب پڑھنے کے بعد رفع ہوگیا۔کتاب کے آخر میں نواب سر امین جنگ بہادر (مولوی احمد حسین صاحب) صدر المہام پیشی اعلیحضرت حضور نظام کا ایک مضمون "فلسفۂ ملل ہنود" بطور ضمیمے کے شریک کردیا ہے۔یہ مضمون بہت خوب ہے اور اس میں علمائے ہنود کی توحید اور حقیقت روح کو بہت صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کے ۶۴ صفحے ہیں اور قیمت آٹھ آنہ۔

داعی اسلام

یہ رسالہ ہر مسلمان کو داعی اسلام بنانے کے لئے لکھا گیا ہے جس میں حفاظت و اشاعت اسلام کی ایسی ایسی حکمتیں اور تدبیریں بتائی ہیں کہ آدمی پڑھکر ششدر رہ جاتا ہے۔اس سے جناب خواجہ صاحب کی جودت و جدت طبع۔ان کی نظر کی وسعت اور گہرائی۔ان کی ہوشیاری اور رسائی فکر معلوم ہوتی ہے۔یہ رسالہ عجب انداز سے لکھا ہے۔اول ان تمام تقریبوں۔رسموں۔عام و خاص رواجوں کو نام بنام گنوایا ہے جن کے اندر قبول اسلام کی ترغیب پائی جاتی ہے یا جن کو دعوت اسلام میں بطور حکمت کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔اس کے بعد دعوت اسلام کے محکمۂ خبر رسانی اور اس کے فرائض کی تفصیل بیان فرمائی ہے جسے پڑھ کر خواجہ صاحب کی طبع مصلحت بیں اور فکر زمانہ شناس کی داد دینی پڑتی ہے۔پھر ہر طبقے اور پیشے کے نام لکھے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ان پیشوں والے دعوت و اشاعت اسلام میں کیا کام کر سکتے ہیں۔اس تفصیل میں شاید ہی کوئی طبقہ یا پیشہ چھٹ گیا ہوگا۔آخر والیان ریاست کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اس میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔

ملک کی بد نصیبی سے جب شدھی کی تحریک ملک میں جاری ہوئی تو ہندو مسلمانوں میں ایسا نفاق پڑا کہ ذرا ذرا سی بات میں اپنی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دینے لگے۔ ممکن نہ تھا کہ جناب خواجہ صاحب ایسے موقع سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے کی کوشش نہ کرتے۔یہ کتاب اور اسی قسم کے اور رسالے اور اشتہارات اسی پھوٹ کا پھل ہیں۔

غزنوی جہاد

خواجہ صاحب کا ارادہ ہندوستانی مسلمانوں کی جنگی تاریخ لکھنے کا ہے اور یہ اس تاریخ کا پہلا حصہ ہے جسے انہوں نے غزنوی جہاد سے موسوم کیا ہے۔اس میں

ان حملوں کا ذکر ھے جو محمود غزنوی نے ھندوستان پر کئے- یہ کتاب نہ تو تاریخی حیثیت سے کوئی خاص وقعت رکھتی ھے اور نہ اس کا طرز بیان ایسا ھے کہ ادبی لحاظ سے قابل وقعت خیال کی جائے- خواجہ صاحب کا خیال ھے کہ "ھر قوم اپنے بزرگوں کے جنگی حالات سن کر زندہ ھوجاتی ھے- خصوصاً کمزوری اور مایوسی کے دنوں میں جنگی تذکرے ان میں از سر نو جان ڈال دیتے ھیں"- اسی خیال کی بنا پر انہوں نے یہ جنگی سلسلہ شروع کیا ھے "تاکہ مسلمانوں کی عورتیں اور بچے ان چھوٹے چھوٹے رسالوں کو پڑھ کر اپنے بزرگوں کے جنگی کارناموں کو جان جائیں" لیکن یہ رسالہ بھی اسی بدبختی کا نتیجہ ھے جس کا ذکر ھم اوپر کر آئے ھیں- چنانچہ خود خواجہ صاحب فرماتے ھیں- "میرا خیال ھے کہ آج کل کے زمانہ میں جبکہ آریہ قوم مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے سر توڑ کوشش میں مصروف ھے اور ھزاروں قسم کے جھوٹے الزام اور بہتان مسلمان بادشاھوں پر لگاتی ھے ان رسالوں کا شائع ھونا بہت مفید ھوگا اور مسلمان آریوں کے جھوٹ سے غلط فہمی کا شکار نہونے پائیں گے اور ان کو اپنے مسلمان حکام اور تاجداروں کے اصلی واقعات معلوم ھوتے رھیں گے"- ھمیں اس میں شبہہ ھے کہ اس قسم کے رسالوں سے یہ مقصد پورا ھوگا- بلکہ اس زمانے میں نفاق کی بھڑکتی ھوئی آگ میں یہ تیل کا کام دیں گے---

خواجہ صاحب نے اس رسالے میں کسی تحقیق سے کام نہیں لیا بلکہ تاریخ فرشتہ سے واقعات نقل کردئے ھیں- سومنات کے وجہ تسمیہ میں مسلمان مورخوں میں اختلاف ھے ان کو خواجہ صاحب نے غلط بتایا ھے اور خود صحیح وجہ تسمیہ یہ بتائی ھے کہ سوم ایک راجہ کا نام تھا اور نات ایک بڑا بت تھا- جو اس راجہ نے بنوایا تھا- بعدہ کثرت استعمال سے سومنات اس مقام کا نام ھوگیا- ایک دوسری جگہ فرماتے ھیں "ھندو قوم کا مذھب عناصر پرستی ھے- اس کے جس قدر بت خانے ھیں ان کا تعلق کسی نہ کسی عنصر سے یا سیارہ سے ھوتا ھے- سومنات چاند کا مندر تھا- سوم چاند کو کہتے ھیں"- ھماری رائے میں خواجہ صاحب نے جو یہ دو وجوہ بتائی ھیں وہ بھی صحیح نہیں معلوم ھوتیں- سوم کے معنے بیشک چاند کے ھیں- مگر نات کے معنے مندر کے نہیں- یہ لفظ ناتھ ھے جس کے معنے آقا کے ھیں- چاند کے آقا شیو جی (مہادیو) ھیں کیونکہ ان کے ماتھے پر چاند ھے- اس لئے یہ مندر شیو جی سے منسوب ھے- قیمت ۸ آنہ---

متفرق

طب

کتاب علم الجراحت

اس کتاب کی تالیف و ترجمه کا کام زبدۃالحکما حکیم محمد کبیرالدین صاحب بہاری پروفیسر طبیه کالج دھلی نے انجام دیا ھے اور ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب ایل-ایم-ایس مڈیکل آفیسر ریاست بڑوانی نے خاص طور سے ان کی مدد کی ھے-سرورق پر کہیں نہیں لکھا که یه کونسی جلد ھے-آگے چل کر کسی جگه البته مذکور ھے که یه پہلی جلد ھے-مضامین کے لحاظ سے البته معلوم ھوتا ھے که پوری کتاب کے ختم کرنے کے لئے کم ازکم ایسی تین یا چار جلدیں اور درکار ھوں گی-تعداد طبع اول ۱۰۰۰ اور قیمت پانچ روپیه ھے-مطبوعه سنه ۱۹۲۳ع-اوسط تقطیع لکھائی ار ر کاغذ عمدہ ھے-کل صفحے ۵۰۸ ھیں-شروع میں فہرست مضامین ھیں مگر آخر میں مضمون نما (Index) نہیں-چند تصاویر بھی ھیں جن میں سے بعض کسی قدر مبہم و ناقص ھیں-افسوس که شاید خرچ زیادہ ھونے کی وجه سے عمدہ اور رنگین تصاویر کا انتظام نہیں ھو سکا-کتاب میں کسی جگه حوالوں کا پته نہیں اور نه یه بتایا گیا ھے که کن انگریزی ر مصری کتابوں سے مدد لی گئی ھے—

اس کتاب کے شروع میں ڈاکٹر محمد عثمان خاں نے نہایت قابلیت کے ساتھه ۷۲ صفحه کا ایک مقدمه یا تبصرہ لکھا ھے جس میں علم طب و فن جراحت کی قدیم تاریخ و موجودہ ترقی پر بحث کی ھے—

آخرالذکر پر بہت ھی کم لکھا ھے-پاسٹیور اور لسٹر کا کہیں ذکر نہیں-قدامت پرستی کی جھلک زیادہ تر نمایاں ھے-مثلاً ملاحظه ھو صفحه ۲۰ "بقراط کے اعمال جراحیه باستثناے بعض کے اصل میں وھی ھیں جو آج زیادہ مہذب و آراسته ھو کر مہذب دنیا میں رائج ھیں" اگر قابل مبصر کو بروزد ولکم کا مشہور عجائب گھر (آلات جراحیه وغرہ کا) لندن میں دیکھنے کا اتفاق ھوتا تو شاید اپنے اس دعوے کو کسی قدر مبالغه آمیز سمجھتے-اسی طرح اس صفحے پر لکھا ھے "فخر ایجاد قدیم ھنود کا ھی حصه ھے"-یعنی یونانیوں نے ھنود سے اخذ کیا-مصریوں کا کہیں ذکر نہیں حالانکه اب یه پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ھے که مصریوں میں علم طب نہایت قدیم

تھا اور کچھ عجب نہیں کہ ہنود اور یونانیوں نے بہت سی باتیں انہیں سے اخذ کی ہوں—

آگے چل کر صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں کہ ابن زہر حکیم ابن رشد کا استاد تھا۔ مگر جہاں تک مجھے خیال ہے موسیو رنیان نے اسے اس کا ہم عصر اور دوست بتایا ہے۔ صفحہ ۵۶ پر پرانے حکما کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "آلۂ عکس کشی تو درکنار شعاع رانت جیننی کے تیز ترین شعاعوں کی عینک چڑھا کر تشخیص ہوئی اور وہ بھی فی صدی نوے حالات میں غلط۔ امتحان قارورہ کے لئے ان کے پاس نہ جدید کیمیاوی تکلفات کا گورک دھندا تھا نہ بے شمار آلات دقیقہ کی زنبیل۔ مگر وہ امراض مثانہ و قلب کی تہ کو ایک ہی غلط انداز نظر میں پہنچ جاتے تھے"—

اس قسم کی یکطرفہ مبالغہ آمیز تحریر مضمون کی وقعت کو نظر سے گرا دیتی ہے اور ایک سائنس داں کے قلم سے حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض قدیم حکیم تشخیص میں ید طولیٰ رکھتے تھے مگر ساتھ ہی یہ کہنا کہ موجودہ ماہرین فن بشرطیکہ انہیں آلات کا استعمال معلوم ہو نوے فی صدی غلطیاں کرتے ہیں نہ صرف غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ ہٹ دھرمی و تعصب پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اصطلاحات کے متعلق صفحہ ۶۹ پر لکھا ہے "اصطلاحات کے معاملہ میں سخت قواعد و آہنی حدود کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔نہ کوئی ایک مسلمہ دستور العمل یا واحد مشرب زبان آفرینی کا ٹھیکہ‌دار ہو سکتا ہے۔"مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ زبان آفرینی اور اصطلاحات بنانا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔اگر "اس میں سخت قواعد و آہنی حدود کی پابندی نہ کی جائیگی" اور ہر مصنف یا مترجم اپنے خیال و رائے کے مطابق اصطلاحیں گھڑ لیا کرے گا اور مطابقت اور یکسانی پیدا نہ ہوگی تو کتب سائنس کا لکھنا ہماری زبان میں نہ صرف مشکل بلکہ پڑھنا اور سمجھنا بھی سخت پریشان کن ہو جائے گا—یورپ میں ایک خاص انجمن اس کے لئے مقرر ہے۔وہ کسی خاص ملک کی نہیں بلکہ بین الاقوام ہے اور بلا اس کی اجازت کے کسی اصطلاح میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ہمارے ملک میں بھی ایک ایسی ہی مرکزی انجمن کی سخت ضرورت ہے ورنہ یہ نتیجہ ہوگا کہ بعض کتابیں مولانا حکیم محمد کبیر الدین صاحب کے اصول پر لکھی جائیں گی۔بعض مولوی وحیدالدین سلیم صاحب اور بعض دوسرے حضرات کی رائے پر جو بجائے آلہ مسماع الصدر۔یا سینہ بین کے۔لفظ استتھسکوپ کو ترجیح دیں گے—

کتاب علم الجراحت میں چھ باب ہیں—پہلا علم جراثیم۔عدویٰ۔مناعت دوسرا التہاب—ورم حار۔تیسرا عدویٰ صدیدیہ غیر نوعیہ۔چوتھا تقرح۔پانچواں غانغرانا چھٹا۔امراض نوعیہ عفونیہ۔قابل مولف و مترجم کی زبان دانی میں کوئی کلام نہیں

کہیں ترجمه کا شبه نہیں ھوتا-عبارت سلیس اور مضمون کی شان کے مطابق بلیغ و پر معنی ھے-اصطلاحات کا مرحله طے کر لینے کے بعد کوئی مسئله ایسا نہیں جو پڑھنے سے سمجھه میں نه آسکے-یا اس کی عبارت مبہم یا معنی سے قاصر ھو-یه واقعی نہایت قابل تعریف ھے-خصوصاً جب یه خیال کیا جاتا ھے که اس کتاب کا ترجمه ایک ایسے شخص نے کیا ھے جس کے نام کے شروع میں صرف لفظ حکیم ھے اور ڈاکٹری کی تعلیم اس نے ایسی باضابطه حاصل نہیں کی که کسی ڈگری یا ڈپلوما کا مستحق ھو سکتا—

ھر صفحے کے نیچے لاطینی و انگریزی مرادفات لکھه دئے گئے ھیں-جن سے سمجھنے میں آسانی ھوتی ھے-بہتر ھوتا که ان کی ایک فرھنگ خط انگریزی میں بھی ضمیمه کے طور پر کتاب کے آخر میں مندرج کر دی جاتی-اصطلاحات زیادہ تر علامۂ بہاری (حکیم محمد کبیرالدین صاحب) کے طبع زاد معلوم ھوتی ھیں-انہیں ''امراض-آلات و اعضا کے ناموں میں قدما کی کتب سے کافی ذخیرہ ملا ھے مگر جدید معلومات و انکشافات کے لئے نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑی ھیں جس میں اصول تسمیه کا امکانی کوشش بھر لحاظ کیا ھے''-وہ جدید مصری مترادفات کے جو مائی کروبز کو بجاے جراثیم یا اجساد دقیقه کے میکروبات کہنا پسند کرتے ھیں-بظاھر مخالف معلوم ھوتے ھیں اور زبان عربی سے پوری طور سے مدد لینا چاھتے ھیں اور ان کے خیال میں ''عربی اور فارسی کا تعلق اس قدر گہرا اور وسیع ھے که ھندوستان کا ایک جاھل دھقان بھی اداے مطلب کے لئے سیکڑوں فارسی اور عربی الفاظ استعمال کرتا ھے''-اگر یه اصول ٹھیک ھے اور اھل زبان اور انجمن وضع اصطلاحات نے (بشرطیکه کوئی ھو) اس پر اتفاق کر لیا-یعنی اور دیگر طریقوں و اصولوں پر اسے ترجیح دی تو اس میں کچھه شک نہیں که علامۂ بہاری کا ھمیں بہت مشکور ھونا چاھئے اور یه کہنا چاھئے که انہوں نے ایک بڑے دشوار گذار مرحلے کو طے کر دیا اور علم طب جدید کے لئے زبان اردو میں ایک آسان راسته کھول دیا-قبل اس کے که صاحب مذکور کے اس اصول کے موافق یا مخالف کچھه کہا جائے بہتر ھو گا که ان کی اصطلاحات کی چند مثالیں پیش کی جائیں—

(۱) تمام اصطلاحات کو زیادہ تر عربی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کیگئی ھے اور بسا اوقات ان کا لفظی ترجمه کر دیا ھے مثلاً جراثیم عقدیه صدیدیه (استرپٹو کاکس پیاجے نس Streptococcus pyogenes)-ھواے شہیق (اکسپائرڈ ایر)-ورم سحابی (کلاوڈی سولنگ) (۲) بعض لفظی ترجمه نہیں بلکه مترادف الفاظ ھیں ان کی تعداد کم ھے مثلاً ناصور (فسٹولا)-کباب چینی (کیوبب)-سیلان رحم (لیوکوریا) (۳) بعض ایسے عام فہم انگریزی الفاظ جو آجکل اردو میں رائج ھو گئے ھیں وہ بھی نکال دئے گئے ھیں اور عربی ترجمه کو ترجیح دیگئی ھے-مثلاً مقیاس الحرارت-تھرمامیٹر کے

لئے- لنجات- پولٹیس کے لئے -قیراط انچ کے لئے اور آب ریہ سوڈا واٹر کے لئے (۴) بعض الفاظ خصوصاً ناموں کو معرب بنایا ھے مثلاً لیزول (لائی سال)- سلورزن (سلورسان)- انورسما (انورزم) - ھشنصوں [ھچنسن- جو ایک مشہور ڈاکٹر گذرا ھے]- پیرافیں اور سنتی میتر میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی- [۵] بعض الفاظ کے معنی کسی قدر مبہم ھیں اور مفہوم کو پوری طور سے ادا نہیں کرتے- مثلاً مالیکول کے لئے ذرہ اور گلاس سلائڈ کے لئے کانچ کا ٹکڑا- مننجائیٹیس کے لئے سرسام غشائی [جو اصول اختیار کیا گیا ھے اس کے لحاظ سے اسے التہاب غشائی کہنا چاھئے تھا] کیریز کے لئے سڑی ھوئی ھڈی- [۶] بعض الفاظ کے لئے فارسی ترکیب کو ترجیح دی گئی ھے- غیر ھوائی [ان ایاروب] قطرہ آویزان [ھینگنگ ڈارپ] زخم کے انگور [گرینولیش] شیرہ [اماشن] [۷] کیمیاوي اصطلاحات میں عربی و فارسی دونوں مخلوط ھیں- مجھے معلوم نہیں کہ دارالترجمہ حیدرآباد میں جو الفاظ وضع کئے گئے ھیں ان کی مطابقت کی گئی ھے یا نہیں- فوریں [فاسفرس] نورآگین [فاسفیٹ] جست حمض آمیز [زنک آکسائڈ]- لاطینی زبان میں اگر کسی کیمیاوی مرکب کے آخری جزو یا عنصر کے دو مالیکول ھیں تو اس کے نام کے آخر میں آئڈ ide بڑھا دیا جاتا ھے- اگر تین ھیں تو آئٹ ite- اگر چار ھیں تو ایٹ ate اضافہ کرتے ھیں- الفاظ آگیں- آمیز و آمیختہ جو ھم معنی ھیں ان تینوں مطالب کے لئے جدا جدا استعمال کرنے کے لئے کہاں تک موزوں و مناسب ھوسکتے ھیں ؟ یہ سوال بہت کچھ تصفیہ طلب ھے- مفردات کے لئے " ین " آخر میں زائد کیا گیا ھے- مثلاً فاسفورس [نورین]- آکسجن [حمضین]- آؤڈین [بنفشیں]- اسپرین [نفسین- مگر دقت یہ ھے کہ اسپرین مرکب ھے]- ۸) متعدد الفاظ کے لئے دو اصطلاحیں ساتھ ساتھ لکھ دی گئی ھیں اور پورا تصفیہ نہیں کیا گیا مثلاً گول پٹی [عصابہ مدحرجہ]- فصلی بخار [حمی متقطعہ]- خورد بین [آلہ مجہر]- جھلیاں [لفائف]- قوت حیوانیہ [قابلیت حیات]- پچکاری [محقنہ جلدیہ] —

علامہ بہاری کے مختلف طریقوں کو بیان کرنے کے بعد اب ضروری ھے کہ اس اصول سے بحث کی جائے جس پر ان کا عمل درآمد رہا ھے- وہ انگریزی و لاطینی اصطلاحات کو زبان اردو سے دور کر کے ترجمہ یا مترادف عربی الفاظ کو ترجیح دیتے ھیں اور اس کے موافق جو وجوہ پیش کرتے ھیں وہ یہ ھیں —

۱- لاطینی الفاظ سے ھمارے کان " بالکل ناآشنا ھیں "—

۲- لاطینی اصطلاحات " ھماری زبان کی ترقی کے لئے مفید نہیں ھوسکیں "—

۳- عربی و فارسی سے تمام مترادفات و اصطلاحات وضع کئے جاسکتے ھیں —

ان تینوں باتوں کے کسی حد تک صحیح ھونے میں کلام نہیں- مگر اب فریق ثانی کے اعتراضات کو بھی دیکھنا چاھئے اور اس کی بعض مشکلات کو حل کرنے کی کوشش

کرنا چاهئے-وہ یہ هیں:—

(۱) عربی میں لاطینی کے طرح اصطلاحات بنانے میں ایسی آسانی نہیں-لاطینی لفظ کے شروع یا آخر میں چھوٹی چھوٹی علامات لگا دینے سے بہت سے نئے الفاظ بن سکتے هیں مثلاً آئی ٹیز کے زائد کر دینے سے التهاب کے معنی پیدا هو جاتے هیں مننجیز (Meninges) سے مننجائیٹز Meningetes هو گیا-عربی میں ایک پورا لفظ زائد کرکے اسی کو التهاب غشائی کہنا پڑے گا—

(۲) اردو زبان مختلف زبانوں کا مجموعہ هے-وہ عربی اور فارسی نہیں هے جو صرف ایک ملک و قوم کے لئے محدود هو-اسے هم کل هندوستان کے لئے موزوں بنانا چاهتے هیں جس میں مختلف اقوام اور مختلف زبانوں کے لوگ بستے هیں-اس میں شک نہیں کہ عربی و فارسی کے اس میں بہت سے الفاظ هیں مگر ساتھہ هی سنسکرت اور هندی کے الفاظ بھی کچھہ کم نہیں اور انگریزی الفاظ بھی اب بکثرت رواج پاتے جاتے هیں-یہ کہنا کہ " هندوستان کا ایک جاهل دهقان بھی اداے مطلب کے لئے سیکڑوں فارسی اور عربی الفاظ استعمال کرتا هے " مبالغہ آمیز هے-سواے مہالک متحدہ کے فارسی و عربی تو کجا سادی هندي اردو سے بھی اکثر دهقانوں کے کان ناآشنا پائے جائیں گے-عثمانیہ میڈیکل کالج کا [جس کے نصاب کو اردو میں کرنے کا ارادہ هے] ایک طالب علم [زیادہ تعداد هندؤں کی هے] جس کی زبان شاید مرهٹی هے " حونیہ متشکلہ " کو زیادہ مشکل و ناآشنا سمجھے گا یا " ایهی با " کو-اگر یہ اصطلاحات طبیہ کالج دهلی کے جماعت سال سوئم و چہارم کے لئے مخصوص هیں تو کسی کو اعتراض نہیں هو سکتا-مگر همارا منشا یہ نہ هونا چاهئے کہ علمی کتابوں کو کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص کردیں بلکہ یہ نصب العین سامنے رهنا چاهئے کہ کسی زمانہ میں تمام علوم و فنون هماری هی زبان میں هندوستان کے هر صوبہ میں پڑهائے جائیں گے اور ان کے لئے سب سے زیادہ موزوں کیا طریقے هو سکتے هیں ؟

(۳) ڈاکٹری یا مغربی علم طب کی حالت همارے ملک میں دیگر شعبہاے سائنس سے بالکل مختلف هے-یعنی کیمسٹری و طبیعات کے جاننے والے بہت کم هیں مگر انگریزی دواؤں وغیرہ کا چرچا هر گھر میں زیادہ هوتا جا رها هے-بکثرت ادویات کے ناموں سے معمولی لوگوں کے کان آشنا هوگئے هیں-دواخانے بھی انگریزی زبان کے نسخوں کے عادی هیں-اگر عربی مترادفات میں نسخے لکھے گئے تو یا تو ان کی سمجھہ میں آنا ناممکن هے یا ان کو ایک علیحدہ فہرست اس کی اپنے پاس رکھنی پڑے گی اور قدم قدم پر غلطیاں کریں گے—

(۴) عموماً ڈاکٹری کے طالب علم انگریزی داں هوتے هیں-اگر اردو هی میں تمام نصاب کر دیا جائے تو بھی اس زبان کی تعلیم بند نہیں کی جاسکتی-ظاهر هے کہ

یہ طالب علم دوسری کتابوں سے بھی مدد لینا چاھیں گے جو صرف انگریزی ھی میں موجود ھوں گی اور بعض اپنے افادہ و ترقی علم کے لئے طبی رسائل و اخبارات کو بھی غیر زبان میں پڑھنا چاھیں گے-جس کے یہ معنی ھوئے کہ لاطینی اصطلاحیں لامحالہ انہیں معلوم ھونا چاھئیں اور اس طرح دھری محنت انہیں کرنی پڑے گی جو بالکل غیر ضروری ھے غرضکہ ان تمام باتوں کو واضعین اصطلاحات طبی اور خصوصاً اس انجمن کو جسے بہت جلد اس کام کو اپنے ذمہ لینا چاھئے مدنظر رکھنا چاھئے-ممکن ھے کہ وہ لاطینی الفاظ کے ذخار سمندر کو دیکھکر گھبرا جائیں اور فطرتی جذبات قومی بھی غالب آکر غیر جنس زبان سے مدد لینے پر آمادہ نہ کریں- ایسی حالت میں اگر مصریوں کے طرح ایک درمیانی راہ اختیار کی جائے تو کیا ھرج ھے ؟ بعض بعض آسان عربی اصطلاحات کو بھی قائم رکھا جائے-بجاے بکٹیریا کے جراثیم کہا جائے-مگر ٹائفائد بخار کو بجاے حمی مطبقہ متناقصہ کے ٹیفوڈ کے نام سے یاد کیا جائے-مقیاس الحرارت کو تھرما میٹر رکھا جاے-پروٹو زواکو بجاے حونیات کے بروتوزوا-پولٹس کو پلٹس-اسٹتھسکوپ کو سینہ بین-چنانچہ اس طرح فریقین کو شاید کوئی شکایت کا موقعہ نہ ملے اور ان کے سمجھنے میں بھی دقت نہ ھو جیسا اوپر مذکور ھوچکا ھے گو ھر شخص کو اپنی راے دینے کا اختیار ھے مگر اصطلاحات کے موضوع کا تمامتر فیصلہ کثرت راے پر ھونا چاھئے اور اس کا کام ایسی انجمن کے سپرد کرنا چاھئے جس کے افراد کی قابلیت پر سب کو اعتماد کلی ھو اور ان کی پوری طرح سے پیروی کی جائے-الغرض یہ نہایت اھم مسئلہ ابھی تک فیصلہ کا محتاج ھے-مگر کتاب زیر ریویو کی خوبیوں میں اس سے ھرگز کوئی کمی نہیں عائد ھوسکتی-میرے خیال میں اردو زبان میں ابتک اس سے بہتر ترجمہ کسی سرجری کے کتاب کا نہیں کیا گیا اور امید ھے کہ لائق مصنف باقی جلدوں کو بھی تالیف کرکے مدرسۂ طبیہ کے نصاب میں ایک نہایت گران بہا اور قابل قدر اضافہ فرمائیں گے—

(نوٹ:— مکرم اڈیٹر رسالۂ "اردو" سے گزارش ھے کہ میں نے سنا ھے ڈاکٹری کتابوں کا ترجمہ عنقریب حیدرآباد میں شروع ھونے والا ھے-مگر جہاں تک مجھے خیال ھے اصطلاحات کا تصفیہ کرنے کے لئے کوئی خاص انجمن یا مرکزی جماعت ابھی تک مقرر نہیں کی گئی-اس کی سخت ضرورت ھے-اگر یہ ممکن نہ ھو سکے تو آپ مہربانی فرماکر ھندوستان کے مختلف ماھرین کو خطوط لکھکر ان کی راے دریافت کرسکتے ھیں اور رسالۂ اردو میں ایک نہایت عمدہ ومفید بحث اس مضمون پر ھوسکتی ھے کہ آیا عربی اصطلاحات قائم کئے جائیں یا لاطینی یا ان کی مرادفات)

مرقومہ ل-ح-خ (ڈاکٹر)

ہیئت جدید

مولفین نے جیسا دیباچہ میں اس کا ذکر کیا ہے ہیئت جدید زیادہ تر پروفیسر ینگ کی بڑی کتاب جنرل اسٹرونومی کی بنا پر تالیف کی گئی ہے مگر کتاب کا حیطۂ اقتباس یہیں تک محدود نہیں رکھا گیا۔قدیم اور جدید ہیئت کے مسائل ہیئت کی تمام مستند کتابوں اور رسالوں سے اخذ کر کے بے حد سادگی اور سلاست سے پیش کئے گئے ہیں۔علم ہیئت کی اصولی تفہیم بغیر اعلیٰ ریاضی کے دقیق مسائل کے نہیں ہو سکتی۔ان کو جگہ نہیں دی گئی۔مگر ابتدائی ریاضی کی مدد سے جہاں تک افلاک کی ترتیب و نظم کے اساسی اصولوں پر روشنی ڈالی جا سکتی تھی کتاب کے متن میں ایسے کلیات ریاضی سے جا بجا امداد لی گئی ہے۔کتاب کی طبیعی اور "بیانی" حیثیت مکمل ہے—

ہیئت جدید بہت ضخیم کتاب ہے ۸۰۹ صفحات۔تین حصوں اور سات مقالوں پر مشتمل ہے۔مقالہ اول کی تالیفات میں مزید تفصیل کی گنجائش ہے۔کرۂ فلکی کے خطوط حوالہ کا زمین کے متناظر خطوط کے ساتھ ملتبس ہونے کا احتمال ہے۔زمین کے مقام کو فضا میں قائم کر کے اس کے خطوط کا تطابق کرۂ سماوی کے خطوط کے ساتھ پہلے صحت سے پیدا کرنا زیادہ مناسب تھا۔ہیئت کی کم کتابوں میں تواریخ عالم کے تفصیلی حالات مندرج ہوتے ہیں۔باب ششم حصۂ اول خوبی مضمون اور معلومات کے لحاظ سے یگانہ ہے۔دوسرا مقالہ تجاذب مادہ اور اس کے مظہرات پر ہے یہ زیادہ تر ریاضی ہے اس کی ترتیب و ترجیہ ہیئت کی عام کتابوں سے مختلف اور قابل ترجیح ہے۔عملی ہیئت مزید توجہ کی مستحق تھی۔تجزیۂ نور جس کے ساتھ علم ہیئت کی آئندہ تحقیق ایک مدت تک وابستہ ہے اس کتاب کے مکمل اوراق میں سے ہے۔گرہنوں کا بیان پرانے توہمات کی پوری تردید ہے۔سیروس کی تشریح بالتفصیل کی گئی ہے۔مناظر کسوف و خسوف واقعات کی دہشت خیز عبارت میں مرقوم ہیں

حصہ دوم و سوم بالترتیب نظام شمسی اور ثوابت سے متعلق ہیں۔پوری وسعت سے سیارات سفلی و علوی کا بیان یکے بعد دیگرے ترتیب وار منضبط ہے۔کسی جرم کی کسی کیفیت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو مولفین کی نظر سے حجاب میں رہا ہو ایسا مبسوط بیان ایک جگہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ثوابت کے مجمعے اور جھرمٹ۔ان کی شناخت آسمان میں۔ان کے مختصر حالات۔ان کا تغیر۔ان کی حرکات اجمالی طور پر پوری صحت سے مندرج ہیں۔آخر میں ارتقائے عالم۔نظریۂ سحابیہ۔آغاز و انجام عالم کے متعلق حکماء محققین پر ہیئت کے قیاسات پیش کئے گئے ہیں۔

نظریہ آئین ستائین کا سرسری ذکر عطارد کی بے قاعدہ حرکت کی ضمن میں آیا ہے۔ مگر اس نظریہ کی پوری حقیقت اور علم ہیئت کے رگ و ریشہ میں اس کے اطلاق کی ترقیم ابھی باقی ہے—

سائنس اور ریاضی داں دو واجب التعظیم افراد کے متحدہ افکار اور کوششوں کا بہترین نتیجہ "ہیئت جدید" اردو زبان میں علم ہیئت پر پہلی مستند کتاب ہونے کا مرتبہ رکھتی ہے۔عبارت اهل سائنس کے قلم کی معلوم ہوتی ہے۔امور ایک دوسرے سے مترشح ہوتے ہیں۔ان کا باہمی تعلق عیاں ہے لیکن سطح سے زیادہ نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی گئی۔تمام اقسام کے مطالب فراهم کر کے ان کو کھلے دل سے کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔عام ناظر کے لئے یہ افسانۂ افلاک مکمل۔دلچسپ۔خوش کن واقعات عالم کا صحیفہ ہے مگر گہرے غوطہ زن طالب علم کا تجسس پورا نہیں ہوتا۔ فرهنگ مصطلحات مکمل ہے۔اس کے دیکھنے سے قدرے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قدیم اصطلاحات کو کھود کر نکالنے۔ان کی تصدیق کرنے اور نئی اصطلاحات کے وضع کرنے میں کس قدر جدت۔محنت اور استقلال سے کام لیا گیا ہے مگر مصطلحات میں تکلف ہے تسہیل علم میں پرانی قیود سے ایک حد تک آزادی برتنا زیادہ مناسب تھا—

ہیئت جدید تحفۂ افلاک ہے۔دنیا کے تنگ فاصلوں کو چھوڑ کر وسعت مافی السموات کا تخیل انسانی محدود دلوں میں پیدا کرتی ہے۔اس کی اشاعت علم اور علم دوست دنیا کی سچی خدمت ہے۔یہ کتاب ہر طرح سے مقبولیت کی مستحق ہے اور امید ہے کہ مقبول ہو گی—

سیاسیات

آج کل اردو زبان میں اکثر علمی کتابیں ترجمہ یا تصنیف ہو رہی ہیں لیکن سیاسیات پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔اب یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ محمد اجمل خاں صاحب بی۔اے (علیگ) نے اس نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں اصول سیاسیات پر علمی بحث کی ہے۔جیسا کہ خود مصنف صاحب دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں اس کتاب کا مقصد یہ ہے "کہ ماہرین سیاسیات کے خیالات کو باقاعدہ مسلسل اور علمی طریقہ سے جمع کیا جائے" اور اس میں شک نہیں کہ اس مقصد کو یہ کتاب بہت اچھی طرح پورا کرتی ہے —

کتاب میں آٹھ باب ہیں اور ہر باب چند مقالات پر مشتمل ہے۔یہ ترتیب کسی قدر پیچیدہ ہے۔اس سے کتاب میں " لکچر نوٹس" کی شان ضرور پیدا ہو گئی ہے۔بے شمار عنوانات ہیں اور ہر عنوان پر چند سطروں میں بحث کی گئی ہے۔لیکن مستقل علمی بحث کے لئے جس تفصیل اور وسعت نظر کی ضرورت ہے وہ کہیں نہیں پائی جاتی مثلاً

صفحہ ۲۷۲ پر ایک نیا مقالہ ”سلطنت بحیثیت نظام الہی“ شروع ہوا ہے-یہ مقالہ صفحہ ۲۷۵ پر ختم ہو جاتا ہے لیکن ان صفحات میں جو کچھ معلومات فراہم کی گئی ہیں انہیں آٹھ چھوٹے چھوٹے عنوانات پر تقسیم کر دیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں (۱) خدا کی براہ راست حکومت (۲) خدا کی بالواسطہ حکومت (۳) بادشاہی حکومت (۴) بادشاہ مثل خدائی نمایندے کے (۵) الہی احکام (۶) غیر ذمہ داری (۷) جبر و قدر (۸) دونوں کی کمزوری-ذہن پوری طور پر ایک عنوان کو سمجھنے بھی نہیں پاتا کہ ایک دوسرا عنوان سامنے آجاتا ہے اور بحث تشنہ رہ جاتی ہے—

مختصر یہ کہ اس کتاب میں اگر کوئی خامی ہے تو وہ یہی ہے کہ یہ بہت سرسری ہے-طلبا اور متعلمین سیاسیات کے لئے بہت مفید ہے لیکن جو سیاسیات کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقف نہ ہو اس کی تشفی نہیں کر سکتی-اس کی مثال ”اشتراکی حکومت“ کی بحث ہے-بالشویکی فرقہ کے نام سے ہمارے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے اور اس فرقہ کے اصول حکومت کے متعلق عجیب و غریب روایات عوام میں مشہور ہیں لیکن قابل مصنف نے صرف تین صفحے ”انقلاب روس“ کے عنوان سے لکھے ہیں اور ان میں چھ چھ سات سات سطروں میں ”ذاتی ملکیت“ اور ”اثرات اشتراک“ سے بحث کر دی ہے جو یقیناً بہت کچھ تشنہ ہے—

بعض اصطلاحات کے ترجمے بھی محتاج توجہ ہیں-افسوس ہے کہ جب مصنفین اردو کوئی کتاب ترجمہ کرنے بیٹھتے ہیں تو تحقیق و کوشش سے یہ دریافت نہیں کرتے کہ آیا اس خاص علم کی اصطلاحات کا ترجمہ پہلے ہو چکا ہے یا نہیں-بلکہ خود ترجمہ کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی علم کی اصطلاحات کے مختلف ترجمے ملک میں پھیلتے ہیں اور بہت کچھ الجھن پیدا کرتے ہیں-جامعہ عثمانیہ نے سیاسیات کے متعلق بہت سی اصطلاحات کا ترجمہ کرلیا ہے-اسے ملک میں پھیلانے کی کوشش ہونی چاہئے-مثلاً Sociology کا ترجمہ بجائے اجتماعیات کے ”عمرانیات“ ہونا چاہئے-Mythology کا ترجمہ اساطیر جاہلیہ کیا گیا ہے حالانکہ اس کے لئے صنمیات یا پھر ”دیو مالا“ کا لفظ بہت اچھا موجود ہے-اسی طرح سے Institutions کا ترجمہ تنسیقات کیا گیا ہے حالانکہ ”ادارات“ زیادہ مناسب ہے-”Patriarchal“ کا مفہوم ”خاندانی“ کے لفظ سے کسی طرح پورا نہیں ہوتا-”پدری“ بہت مناسب ہے کیونکہ اس کے مقابل Matriarchal (مادری) موجود ہے-اسی طرح سے Oligarchy کا صحیح مفہوم ”چند سری حکومت“ سے جتنی اچھی طرح واضح ہوتا ہے حکومۃ الخواص سے نہیں ہوتا—

کتاب مجلد ہے لکھائی چھپائی کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں-”ناظم قومی دارالاشاعت-سرائے گدھا-الہ آباد“سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے—

جدید رسالے

——:0:——

گرو سیوک

یہ ماہوار رسالہ " زیر مصلحت مرشدی و مولای حضرت خواجہ حسن نظامی" دہلی سے شائع ہوا ہے۔" مالک و ناشر ملنسار نظامی۔ اڈیٹر بقای نقشبندی دہلوی"۔ " زیر مصلحت " کا لفظ بہت وسیع معنے رکھتا ہے اور خواجہ صاحب کے لئے بہت موزوں ہے۔ رسالے کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ دوسرے نمبر میں پہلا مضمون حضرت خواجہ صاحب کا " گرو بھگتی " پرھے۔ جس میں ارشاد ہوا ہے " خدا اگر ناراض ہو جاے تو ٹھکانا مل سکتا ہے۔ مگر گرو خفا ہوجائے تو پھر کہیں ٹھکانا نہیں۔ کیونکہ اگر گرو راضی ہے تو وہ خداکی ناراضی سے چیلہ کو اپدیش دیکر بچا لے گا اور اگر گرو ناراض ہوگیا تو پھر چیلے کا کہیں بھی ٹھکانا نہیں "۔ دوسرا مضمون " پرم پتا سے فریاد " اورتیسرا " چشتی گرو کی تعلیم " بھی حضرت خواجہ صاحب ہی کے قلم سے نکلے ہیں۔ چوتھا مضمون " جھینگر کی آواز " بھی خواجہ صاحب کا ہے جس میں ان کی انشاپردازی کی خاص شان نظر آتی ہے۔ آخر میں ایک مضون " تن من بیتی " ہے جو خواجہ صاحب کا روزنامچہ ہے اور بہت پر اطف ہے۔ سر ورق بہت خوبصورت ہے۔ چھپائی لکھائی بہت اچھی۔ سالانہ قیمت تین روپے —

المعلم

یہ ماہانہ رسالہ حیدرآباد دکن سے شایع ہوا ہے۔ اس کا موضوع تعلیم ہے۔ حیدرآباد میں ایک ایسے رسالے کی بہت ضرورت تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ باقاعدہ جاری ہونے لگا ہے اور بڑی کمی کو پورا کر رہا ہے۔ مگر یہ سمجھہ میں نہیں آیا کہ اس کے نام میں " ال " کی کیا ضرورت تھی۔ معلم بالکل کافی تھا —

پہلے نمبر میں تین مضمون ہیں۔ تصورات و تخیلات اطفال۔ پیمایش ذہن اور مصلحان تعلیم۔ اس کے بعد رپورٹ ترقی تعلیم ممالک محروسہ سرکارعالی پر تبصرہ اور چند شذرات ہیں۔ پیمائش ذہن مولوی سید وھاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج کا مضمون ہے۔ اردو زبان میں غالباً اس سے قبل اس مسئلہ پر بحث نہیں ہوئی۔

دوسرے نمبر میں پیمائش ذہن اور مصلحان تعلیم کے مضمون جاری ہیں۔ ان کے علاوہ تدریس میں تکان اور بڑودہ کے کتب خانہ کے مضامین ہیں۔ آخر میں قابل اڈیٹر مولوی سید محمد حسین صاحب صدر مہتمم تعلیمات حال نائب ناظم تعلیمات نے

" مضمون نگاری اور ترجمہ اردو امتحان مڈل " پر بہت اچھی تحریر شایع کی ھے اور طلبہ جو زبان اور مضمون نویسی میں عام طور پر غلطیاں کرتے ھیں انہیں مثالیں دیکر ظاھر کیا ھے اور اس کے متعلق مفید ھدایتیں دی ھیں جو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لئے کارآمد ھوں گی۔ لیکن ھماری درخواست ھے کہ خود جناب اڈیٹر صاحب اور ان کے لائق مضمون نگار بھی اس کا خیال رکھیں گے۔ پہلے نمبر میں جو " بیان حال " اڈیٹر صاحب نے تحریر فرمایا ھے اس میں ایسی ھی غلطیاں پائی جاتی ھیں جو طالب علم اپنے مضامین میں کرتے ھیں۔ نمونے کے طور پر چند یہاں لکھی جاتی ھیں —

(۱) یورپ میں مختلف اقوام میں ایسے نیک وجود گزرے ھیں جو ... ملک و قوم کی تعلیمی حالت کی ترویج و ترقی پر اپنے قلم دماغ اور مال و دولت بلکہ اپنی ھستیوں کو قربان کر دیا —

(۲) " بعض اضلاع میں کانفرنس اساتذہ منعقد ھوئیں " —

(۳) " نارمل اسکولس سے جو مدرسین ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد دیہی مدارس روانہ کئے جاتے ھیں " —

(۴) " وقتاً فوقتاً " - یہ فقرہ بار بار اسی طرح استعمال کیا گیا ھے —

(۵) " اب یہ جادو جس سے بچے اکنات و اطرات کے حالات و اشیاء میں تقلب و تحویل کرتے ھیں رفتہ رفتہ سن کے ساتھ ٹوٹتا جاتا ھے " - محاورہ طلسم ٹوٹتا ھے جادو ٹوٹتا نہیں ھے —

(۶) " کہانی کے واقعات کو بچے سرگشت سمجھنے لگتے ھیں " - سرگشت کا لفظ سمجھ میں نہیں آیا —

(۷) کیڑے کو خود کھا لینا اس لڑکی سے اس لئے واقع ھوا کہ اس لڑکی میں مادہ تخیل و تصور اس درجہ پر تھا کہ وہ اپنے آپ کو چڑیا تصور کر کے کیڑا کھالی —

رسالے کے مقاصد کے ضمن میں یہ بھی بیان کیا گیا ھے کہ اس رسالے کا معیار ملک کے مدرسین مدارس تحتانیہ کی لیاقت اور استعداد کے لحاظ سے رھیگا۔ لیکن ذیل کے جملے جو خود قابل اڈیٹر صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر فرمائے ھیں تحتانیہ مدارس کی لیاقت اور استعداد سے بالا ھیں —

(۱) " دیرینہ تمنائیں اور مخفی آرزوئیں ممکن عدم سے منصۂ ظہور میں آئیں اور بہ حیثیت ایک انسان ظلوم و جہول کے ھم نے اس امانت کے بارگراں کو اپنے سر پر اٹھا لیا ھے —

(۲) یہ طلسمی مادہ تحویل و تقلب اشیا کا سب بچوں میں یکساں نہیں ھوتا۔ بعض جملوں کا طرز بیان پیچیدہ ھے اور بیان میں گنجھلک ھے۔ مثلاً " وھی وہ مضمون

ہیں کہ جن کی تعلیم میں بچوں کو آزادی سے حواس خمسہ کو کام میں لاکر ذاتی تحقیق اور تجسس کی ذریعہ کے کسی نتیجہ کو پہونچنے کا موقع حاصل ہوسکتا ہے" -(بیان حال)

رسالہ کسی قدر مردہ معلوم ہوتا ہے-اس کے مضامیں میں کسی قسم کی شگفتگی نہیں پائی جاتی-اس میں ایسے مضامیں ضرور ہونے چاہئیں جنہیں طلبہ اور مدرسیں شوق سے پڑھیں اور ان میں صحیح ذوق پیدا ہو اور مروجہ طریقۂ تعلیم پر غور کرنے کی ترغیب ہو—

یہ بھی بڑی خوشی کی بات ہے کہ رسالہ ریاست کے دیسی کاغذ پر چھپتا ہے اور لکھائی چھپائی اچھی ہے—

اس میں شبہ نہیں کہ ایسے رسالہ کی یہاں بیحد ضرورت تھی اور اگر مضامیں کے انتخاب اور تحریر میں محنت اور ذوق سلیم سے کام لیا گیا تو یہ بہت مفید ثابت ہوگا-

تعداد صفحات ۳۲-قیمت سالانہ ۳ روپیہ ۸ آنے—

سوز و ساز

اس نام کا رسالہ دھلی سے ہر مہینے "بظل حمایت مصور فطرت حضرت مولانا خواجہ حسن نظامی" شایع ہوتا ہے-اڈیٹر ملک الکلام قوی امروہوی ہیں-اس رسالے میں کیا ہوتا ہے؟ یہ سرورق سے ظاہر ہے-جہاں سب سے اوپر یہ لکھا ہے "اردو زبان کا شاندار علمی-ادبی-تاریخی-مذہبی-اخلاقی-تمدنی-معاشرتی-طبی تفریحی-اصلاحی-ملکی اور سیاسی کا ماہوار مجموعہ" اس کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور حقیقت میں سبھی کچھ ہوتا ہے-جناب خواجہ صاحب کا ظل حمایت کافی ہے-خواجہ صاحب خود بھی کبھی اس میں کچھ تحریر فرماتے ہیں-چنانچہ "پڑوس کے سترہ پاجی" حضرت ہی کا لکھا ہوا ہے-عنوان خود کاتب کی چغلی کھا رہا ہے-مضمون دلچسپ ہے اور خواجہ صاحب نے اپنے خاص طرز میں لکھا ہے یہ پاجی کھٹمل-جوئیں-مچھر-پسو-چوہے-مکڑیاں وغیرہ ہیں-رسالہ مختلف قسم کے مضامین کا اچھا مجموعہ ہے اور سفر و حضر میں دلچسپی کا مشغلہ ہوسکتا ہے-بڑی تقطیع-باریک خط-چھپائی-لکھائی اور کاغذ بہت اچھا-۲۴ صفحے-سالانہ چندہ ساڑھے چار روپیہ—

تحفہ

انجمن ارباب اردو (حیدرآباد دکن) کا ماہوار علمی رسالہ ہے-جس میں

مختلف قسم کے علمی مضامین درج ھیں اور بلحاظ معلومات قابل قدر کوشش ھے۔ اس رسالے کے دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ اھل حیدرآباد میں علمی ذوق پیدا ھوتا جاتا ھے اور یہ امر بہت قابل مسرت ھے۔ رسالہ بڑی تقطیع پر پچاس صفحے کا ھوتا ھے سالانہ چندہ پانچ روپیہ ھے—

تاج

یہ ماھوار رسالہ بھی حیدرآباد دکن سے شایع ھوا ھے۔اس میں علمی اور تاریخی مضامین اچھے لکھے گئے ھیں۔نظم کا بھی کافی حصہ ھے۔ حیدرآباد کے یہ دونوں رسالے یعنی تحفہ اور تاج بلا شبہہ قابل قدر ھیں۔میانہ تقطیع پر ۶۸ صفحے ھوتے ھیں۔سالانہ چندہ چار روپیہ آٹھہ آنے ھے—

نیرنگ خیال

یہ ماھوار رسالہ لاھور سے شایع ھوا ھے جواردو اخباروں اور رسالوں کا مخزن ھے۔اڈیٹروں نے رسالے کے دلچسپ بنانے میں بہت کوشش کی ھے۔شروع میں ایک عمدہ تصویر بھی ھوتی ھے۔اگرچہ اس رسالے میں علمی مضامیں بھی ھوتے ھیں لیکن زیادہ تر ایسے مضامین نظر آتے ھیں جن کا تعلق تخیل سے ھے۔نظمیں بھی ھر قسم کی ھیں۔بڑی تقطیع۔تعداد صفحات ۵۰۔سالانہ چندہ تین روپئے۔اس قیمت میں رسالہ بہت اچھا ھے۔

ستارہ

یہ رسالہ بھی حال ھی میں علی گڈہ سے شایع ھونا شروع ھوا ھے۔ادبی اور علمی مضامین ھوتے ھیں۔نظم کا بھی حصہ ھے۔رسالہ دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ھے۔ تین جز پر مربع نما شایع ھوتا ھے۔سالانہ چندہ تین روپیہ آٹھہ آنے ھے۔اڈیٹر مینا زبیری مارھروی (علیگ) ھیں—

تازہ ترین مطبوعات انجمن

جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ملک محروسۂ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا- نواب صاحب موصوف نے وہاں رہکر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاصکر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا- کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے- جو ہمارے اہل وطن کے لئے بہت سبق آموز ہے- اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے- ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے- خاصکر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں (حجم ۴۸۲ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات

یا

آپ بیتی

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے- حیات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا- یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار

مطبوعات انجمن

تذکرۂ شعرائے اردو

مولفۂ میر حسن دھلوی۔ میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ ان کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ھوا شاید ھی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ھوا ھو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ھے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ھے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ھے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ھے جو قابل پڑھنے کے ھے قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنہ کلدار غیر مجلد ایک روپیہ ۶ آنہ کلدار—

تاریخ تمدن

سر تامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ھے۔ الف سے ی تک تمدن کے ھر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ھے اور ھر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ھے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذھن میں وسعت پیدا ھوتی ھے۔ حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ کلدار—

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ھے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ھکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ھے۔ اس میں بظاھر فطرت کی بحث درج ھے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ھے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار—

القول الاظہر

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الارا تصنیف فوزالاصغر کا یہ اردو ترجمہ ھے یہ کتاب فلسفۂ الہین کے اصول پر لکھی گئی ھے اور مذھب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ھے قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار—

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ھوے ھیں ان سب کو جمع کر دیا ھے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ھے قیمت غیر مجلد ۱۰ آنہ کلدار—

قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوص کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ھے جن اصول

اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہئے ان کی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی گئی ہے قاعدہ غیر مجلد ۲ آنہ کلدار کلید قاعدہ غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسنسپر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے غور و فکر کا بہترین کارنامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۳ روپیہ کلدار غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

دریائے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاءاللہ خاں کی تصنیف ہے اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار - مجلد ۲ روپیہ کلدار —

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے - تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند کئے ہیں - کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپیہ کلدار مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

مشاہیر یونان و رومہ

ترجمہ ہے - سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے - ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے - وطن پرستی اور بے نفسی عزم - جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے - قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپیہ کلدار - مجلد ۴ روپیہ کلدار جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی اے کی تالیف ہے - اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۶ آنہ کلدار حصۂ دوم غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے - معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے - مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے - اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں - اشتراکیت کا باب قابل دید ہے - حجم ۸۸۵ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر - تحقیق صداقت کا مرادف ہے - یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن - معاشرت - اصول اخلاق - مذاہب و خیالات کا مرقع ہے - حصۂ اول مجلد ۳ روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست وشگفتگی کا نمونہ-اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے-ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے-مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے- قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے-علمی اصطلاحات سے معرا-سلاست و روانی سے مملو اور دلچسپ و مفید ہے-طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار—

دیباچۂ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا پانی غذا لباس مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے- زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے- ملک کی بہترین تصنیف ہے-اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا-حجم ایک ہزار صفحے- قیمت مجلد چار روپیہ—

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے- بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت بغیر جلد دو روپیہ کلدار—

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے-اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طورپر معروف نہیں-نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں- مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرلصدور امور مذہبی سرکارعالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے- قیمت مجلد دوروپیہ ۴ انہ کلدار

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے-جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے - متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے-قیمت مجلد دوروپیہ ۸ انہ کلدار غیر مجلد دوروپیہ کلدار—

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشاپرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہاسال کے غور و فکر

اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف " یہ بالکل نیا موضوع ہے۔ میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں"۔اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔ مخالف وموافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے۔سابقوں اور لاحقوں-اردو مصادر اور ان کے مشتقات-غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں-اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہاجاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں-لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند کردئیے ہیں- اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے- مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا-اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے- تعداد صفحات ۳۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار—

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے-خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے-علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے-یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۶۰۴ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃالارا مضمون ہے- اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے-یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا-صاحب نظر قدردانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار

دیوان غالب جدید و قدیم

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا-اس میں میرزا غالب کا قدیم وجدید تمام کلام موجود ہے-مہر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی- یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھہ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے مع مقدمۂ ڈاکٹر عبدالرحمن مجلد پانچ روپیہ کلدار-غیر مجلد چار روپیہ کلدار (بلا مقدمہ مجلد تین روپیہ ۸ انہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار)

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے-اس مین بعض قدیم اقوام-سلطنت کلدانی- آشوری-بابل-بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت-عقائد صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھہ دئے ہیں-اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی۔

جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی وضاحت کے لئے جابجا تصویریں دی گئی ہیں-صفحہ ۲۷۴-قیمت مجلد دو روپیہ ۶ آنہ کلدار

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی-اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے برقیات پریہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے-کہاں سے آتی ہے کیا کام آسکتی ہے-یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے-قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار

---:o:---

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ اباد دکن سے مل سکتی ہیں

(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

(دارالمصنفین اعظم گڈھ)

۱-سیرۃ النبی حصۂ اول ۴ روپیہ
۲-سیرۃ النبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
۳-شعرالعجم مکمل ۵ حصے ۱۳ روپیہ
۴-سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ
۵-علم الکلام ۲ روپیہ
۶-الکلام ۲ روپیہ
۷-کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸-اسوۂ صحابہ مکمل دو حصہ ۸ روپیہ
۹-انقلاب الامم ۲ روپیہ
۱۰-برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱-مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۲-مثنوی بحر المحبت ۱۲ آنہ
۱۳-تفسیر ابو مسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
۱۴-سیر الصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
۱۵-روح الاجتماع ۲ روپیہ

(مطبع کاویانی-برلن)

۱-سفرنامہ حکیم ناصر خسرو (فارسی) ۶ روپیہ ۸ آنہ
۲-زادالمسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
۳-گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۴-تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۵-تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۶-نصاب الصبیان (فارسی) ۱ روپیہ
۷-رهنمائے پسران (فارسی) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸-تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ

---:o:---

(جامعہ ملیہ-علی گڈھ)

۱-الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ
۲-الصراط المستقیم ۲ روپیہ
۳-بصائر ۶ آنہ

۴- سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ
۶- خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ
۸- مبادی معاشیات ۱ روپیہ
۹- انتخاب میر (از نورالرحمن صاحب) ۱ روپیہ
۱۰- قواعد عربی ۲ روپیہ
۱۱- عرض جوہر ۸ آنہ
۱۲- مجموعہ کلام جوہر ۶ آنہ
۱۳- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنہ
۱۴- اظہار العرب ۸ آنہ
۱۵- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
۱۶- ترکوں کی کہانیاں ۴ آنہ
۱۷- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ
۱۸- خطبہ حکیم اجمل خاں صاحب ۲ آنہ

---:o:---

(نظامی پریس - بدایون)

۱ نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
۲- دیوان غالب مشرح مجلد ڈھائی روپیہ
۳- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ ۸ آنہ
۴- دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنہ
۵- دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۶- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
۷- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
۸- لتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
۹- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
۱۰- مراثی انیس جلد اول مجلد ۱۰ روپیہ
۱۱- مراثی انیس جلد دوم قسم اول ۸ روپیہ
۱۲- مراثی انیس جلد دوم قسم دوم ۴ روپیہ
۱۳- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
۱۴- کنز التاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۵- بدمزاج شوہر ۱ آنہ
۱۶- راکھہ بیگم ۱ آنہ

---:o:---

(دائرۂ ادبیہ۔ لکھنؤ)

۱- مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیہ ۸ آنہ
۲- مکاتیب اکبر ۱ روپیہ
۳- مینائے سخن ۱ روپیہ
۴- حزن اختر ۸ آنہ
۵- درس عمل ۴ آنہ
۶- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
۷- بیگمات بنگال ۶ آنہ
۸- اسلام کا اثر یورپ پر ۴ آنہ
۹- مشرقی ترکستان ۶ آنہ
۱۰- سیاحت زمین ۱ روپیہ
۱۱- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

---:o:---

(دوسری قابل قدر کتابیں)

۱- الفاروق ۳ روپیہ
۲- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۸ آنہ
۳- اسلامی مدارس ۴ آنہ
۴- اسلامی حکومت ۲ آنہ
۵- زیب النسا ۲ آنہ
۶- جہانگیر ۲ آنہ
۷- نظم شبلی ۴ آنہ

۸- نفس اللغة	۱ روپیہ
۹- ترانۂ شوق	۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۰- خوبیِ سخن	۸ آنہ
۱۱- دیگر ممالک میں قطع تعلق	۱۰ آنہ
۱۲- صبح امید	۴ آنہ
۱۳- آزادیِ اسلام	۴ آنہ
۱۴- مصطفیٰ کمال پاشا	۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۵- گوکھلے کی تقریریں	۱۲ آنہ
۱۶- سلف گورنمنٹ	۶ آنہ
۱۷- عالم خیال	۸ آنہ
۱۸- شکوۂ اقبال	۲ آنہ
۱۹- جواب شکوہ	۴ آنہ
۲۰- شمع و شاعر	۲ آنہ
۲۱- بلال	۱ آنہ
۲۲- اکبری اقبال	۳ آنہ
۲۳- تصویر درد	۴ آنہ
۲۴- حیات خسرو	۸ آنہ
۲۵- نظام حیات انسانی	۸ آنہ

———:o:———

مکاتیب

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر - دلچسپ - پراز معلومات اور بہترین مجموعہ - مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ - ریاست بھوپال ۱ روپیہ

———:o:———

المشتہر

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

اُردو

۱- یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری-اپریل-جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا—

۲- یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی-حجم کم از کم ایک سو اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو صفحے ہوگا—

۳- بنظر احتیاط رسالہ ذریعۂ رجسٹری بھیجا جاتا ہے—

۴- قیمت سالانہ چھہ روپیہ کلدار-محصول ڈاک وغیرہ ملا کر آٹھہ روپیہ کلدار (سکۂ عثمانیہ سات روپیہ-محصول ڈاک وغیرہ ملا کر نو روپیہ سکۂ عثمانیہ)

۵- تمام خط و کتابت:-آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو و اڈیٹر اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے—

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس-اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔